29 .

(F)

گھونگھٹ میں گوری جلے

(چودہ افسانوں کا مجموعہ)

از

کرشن چندر۔ ایم۔ اے

ایم - آزاد مرزا -

ناشر

ساقی بک ڈپو - دہلی

کمال پرنٹنگ پریس دہلی

بار سوم

قیمت عمر

فہرستِ مضامین

دیباچہ نگاری

جن دنوں میں افسانے لکھا کرتا تھا، افسانہ نگاری کو ادب کی تمام اصناف میں سے مشکل ترین اور ممتاز ترین سمجھا جاتا تھا۔ اور دیباچہ اور دیباچہ نگاری کے متعلق تو میرا یہ خیال تھا کہ یہ ایک سہل ترین ادبی مشغلہ ہے۔ ارضی اور سماوی حقیقتوں کے ساتھ خارجی اور داخلی تخیل کے ڈانڈے ملاؤ، اور ان میں فرائیڈ، جیمس جائس اور اوڈی پس کمپلکس کی آمیزش کرو، اسکے بعد تکنیک، فن کار اور اپچ جیسے الفاظ کا بار بار ذکر کرو، بس دیباچہ تیار ہے۔ اسی خیال کے زیر اثر میں دیباچہ نگاروں کو "ادبی مفت خورے" کہا کرتا تھا۔ اور میرے ذہن میں اُن کی ادبی حیثیت وہی تھی جو میونسپل لائبریریوں سے رسالے چرا کر پڑھنے والوں کی ہے بلکہ تھی۔ (کیوں کہ اب تو میں میونسپل لائبریری سے اخبار اور رسالے چرانے کے کام کو بھی فنونِ لطیفہ میں شمار کرتا ہوں!)

اب کچھ دنوں سے میری توجہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر دیباچہ نگاری کی طرف مائل ہوتی ہے اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں، بلکہ میرے خیال میں تو افسانہ لکھنا دیباچہ لکھنے سے کہیں سہل ہے، افسانے میں مصنف اپنے جذبات سے

جس طرح چاہے کھیل سکتا ہے، جس طرح چاہے واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اگر ہیرو سے ناراض ہو جائے تو اُسے خودکشی پر مجبور کر سکتا ہے۔ اُسے زہر دے سکتا ہے، پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے پٹخ سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ دیباچہ لکھ رہے ہیں تو آپ صاحبِ کتاب کو کسی ایسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ آپ اس کی لکھی ہوئی عبارت کا ایک لفظ بھی نہیں بدل سکتے۔ آپ اپنا افسانہ جب جی چاہے پھاڑ ڈالئے۔ لیکن دیباچہ والی کتاب سے آپ ایسا سلوک کبھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات دیباچہ نگاری کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، اس سے صاحبِ کتاب کی دل شکنی ہوتی ہے۔ پھر اس ملک میں جہاں لوگ سانپوں کو بھی دودھ پلاتے ہیں، اس قسم کا تشدّد کیسے روا رکھا جا سکتا ہے!

جوں جوں میں دیباچہ نگاری کے فن کا مطالعہ کرتا ہوں، مجھے یہ ایک بحرِ ذخّار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی طرح دیباچہ نگاری کی ابتدا اور انتہا معلوم نہیں ہوتی، اس کی وسعت اور گہرائی سے مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ادب کے سمندر میں جس گوہرِ بے بہا کی مجھے تلاش ہے وہ مجھے یہیں سے حاصل ہوگا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکّر اور ادیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے عمر بھر دیباچے لکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا تو میں اور بھی انہماک سے دیباچہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ آپ لاکھ اچھے شاعر ہوں، افسانہ نگار ہوں، ناول نگار ہوں اور ڈرامائسٹ ہوں، آپ کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں، لیکن اگر آپ ایک عدد دیباچہ لکھ دیں تو دُنیائے ادب میں آپ کا نام ستارے کی طرح چمک اُٹھے گا۔ ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ سے ملنے، بات کرنے اور اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوانے کے لئے کوشاں ہوگا۔ لیڈری کے بعد دیباچہ نگاری ہی ایک ایسا فن ہے جس سے آدمی ہندوستان میں ابدی شہرت حاصل کر سکتا

ہو اور اسکے لئے کسی کوٹھی کی ضرورت ہے نہ کار کی نہ ریڈیو سیٹ کی!

شہرت کے علاوہ دیباچہ نگاری کے بھی اور کئی فائدے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صاحبِ کتاب سے آپ کے ذاتی مراسم ہمیشہ کے لئے استوار ہو جاتے ہیں اور عمر بھر آپ کا احسان مند رہتا ہے۔ کبھی کسی مجلس میں آپ کے خلاف وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ اس کی کتاب پر آپ نے دیباچہ لکھا ہے۔ سب لوگ اس امر سے واقف ہیں، اگر آپ کے خلاف کچھ کہتا ہے تو یار لوگ اس کی فطری "کمینہ پن" پر محمول کریں گے۔ اس لئے بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے دوستوں کی بجائے دشمنوں کی کتابوں پر دیباچہ لکھنا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا گُر ہے جسے بہت کم دیباچہ نگار جانتے ہیں۔ لیکن جس کی افادیت آج سے مسلّم سمجھی جانی چاہیئے۔

دیباچہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس سلسلے میں بعض دیباچے ایسے عمدہ ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر کتاب پڑھنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی اور میرے خیال میں تو ایک اچھے دیباچہ نگار کا یہی نصب العین ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے معیار کے دیباچے بہت کم لکھے جاتے ہیں اور اگر لکھے بھی جائیں تو کبھی کبھی صاحبِ کتاب انہیں کتاب میں شامل کرنے سے انکار بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا خطرہ ہے جسے ہر ایک دیباچہ نگار کو بخوشی قبول کرنا چاہیئے۔ اس طرح دیباچہ نگار نہ صرف اپنے فرائضِ منصبی کو سر انجام دیتا ہے بلکہ رفاہِ عام کا کام بھی کرتا ہے۔ آجکل زمانہ پیکار اور کشمکش کا ہے۔ بقائے حیات کے لئے لوگوں کو اتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے کہ وہ ادبی مصروفیتوں کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے۔ وہ ناول چھوڑ کر افسانے پڑھتے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے کی بجائے سینما دیکھتے ہیں۔ اخبار دیکھنے کے بدلے ریڈیو سنتے ہیں۔ اور اب وہ دن بھی دُور نہیں کہ جب کتاب پڑھنے کے بجائے وہ صرف اس کا دیباچہ پڑھا کریں گے۔

دیباچے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لکھے جاتے ہیں، دوسرے وہ جو نہیں لکھے جاتے۔ دوسری قسم میں وہ دیباچے شامل ہیں۔ جہاں صاحبِ کتاب اپنی طرف سے دیباچہ لکھ کر اُس پر کوئی فرضی، جعلی، جھوٹا نام دیدیتا ہے، یا پھر یوں ہوتا ہے کہ کسی دیباچہ میں دیباچہ نگار کا نام اُس سے پوچھے بغیر دیدیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب کو جو ضلع کیمل پور میں درزی ہیں، اپنے غیر مطبوعہ افسانوں کے لئے ایک دیباچے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے جھٹ سے اپنے ایک دوست کو خط لکھ دیا جو بد قسمتی سے دیباچہ نگار کا بھی دوست تھا، کہ وہ اپنے دیباچہ نگار دوست سے ایک عدد دیباچہ لکھوا کر بھیجدے۔ دیباچہ نگار کے دوست نے کچھ کہے سُنے بغیر ہی اپنے دوست کو (دیباچہ نگار کے دوست کو نہیں) لکھدیا کہ وہ خود ہی ایک دیباچہ تیار کرے اور اس میں جو جی چاہے لکھ ڈالے، اور اس پر دیباچہ نگار کا نام دیدے۔ خیریت یہ ہوئی کہ عین وقت پر سب حال معلوم ہو گیا اور اُس نے خود ایک دیباچہ لکھ کر پیچھا چھڑایا۔ خیر یہ تو ایک اتفاق تھا ورنہ عموماً ان حالتوں میں یہ ہوتا ہی کہ دیباچہ نگار کو اپنے دیباچے کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب کتاب چھپ کر اُس کے پاس پہونچ جاتی ہے اور جب وہ اپنے دیباچے میں یہ فقرے پڑھتا ہے کہ جناب شیام کیمل پوری کے افسانے درد، یاس اور غم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، افسانوی نقطہ نگاہ سے وہ ہمیں منشی پریم چند کے ہم پلہ نظر آتے ہیں" تو دیباچہ نگار کا اپنا دل ڈوبنے لگتا ہے، اس وقت اسکے سینے میں جو درد اُٹھتا ہے اور جس طرح اس کے دل پر یاس اور غم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ اچھی طرح سے کر سکتے ہیں جو جعلی دستخط بنانے میں ماہر ہوں یا جن کا روپیہ بنک سے جعلی دستخط بنانے والے نے ہتیا لیا ہو۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ دیباچہ نگار اور صاحبِ کتاب دو مختلف افراد ہوتے ہیں لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ کتاب ہی خود اپنا دیباچہ نگار ہوتا ہے، من تو شدم تو من شدی ——— یہ وہ عرفانی مقام ہی جہاں ساری دوئی مٹ جاتی ہے اور کتاب دیباچے

میں اور دیباچہ کتاب میں مدغم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے۔ اس کا حوصلہ وہی ادیب کر سکتے ہیں جو معرفت کے درجہ تک پہونچ چکے ہوں۔ مقام شکر ہے کہ کئی ترقی پسند، صوفی منش ادیبوں کو بھی اس قسم کا ادبی نروان حاصل ہو چکا ہے۔

دیباچے عموماً دو طرح کے لکھے جاتے ہیں۔ (۱) کتاب پڑھکر (۲) کتاب پڑھے بغیر۔ پہلا طریقہ صرف عطائی اور مبتدی دیباچہ نگار عمل میں لاتے ہیں۔ جو تجربہ کار کہنہ مشق دیباچہ نگار ہیں وہ کبھی کتاب نہیں پڑھتے، بلکہ اکثر کتاب کے نام، مصنف کے اسم گرامی اور نفس مضمون سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ کتاب اور دیباچہ میں جتنا بُعد ہوگا، دیباچہ اتنا ہی عُمدہ ہوگا۔ اور اگر کتاب اور دیباچے میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو اُسے دیباچہ نگاری کی معراج سمجھئے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُردو ادب میں اس قسم کی دیباچہ نگاری کی کئی عُمدہ مثالیں موجود ہیں۔ اور ادب کی کسی اور صنف میں نہ سہی، کم از کم اس صنف میں تو یقیناً ہم مغربی ادب سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ جیساکہ میں ابھی بتا چکا ہوں، ایک اچھے دیباچہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا کتاب کے نفسِ مضمون سے کوئی تعلق ہو، مثال کے طور پر اگر آپ کو چندر بھان اگنی ہوتری کی نئی مثنوی "رفعتِ خیال" پر دیباچہ لکھنا ہے تو آپ اُسے اس طرح شروع کر سکتے ہیں۔

میں مسوری میں اپنی کوٹھی "الہلال" میں بیٹھا ہوا اپنی ننھی لڑکی نجمہ سے باتیں کر رہا تھا نجمہ بڑی شریر ہے۔ (نجمہ کی گھریلو شرارتوں کے متعلق چند لطیفے) اتنے میں میری بیوی مسکراتی ہوئی اندر آئیں۔ میری بیوی کو مسکرانے اور پان کھانے کی بہت بُری عادت ہے، (بیوی کے متعلق ایک پیرا) بیوی نے مجھے اگنی ہوتری جی کا ایک خط دیا۔ جو ابھی ابھی ڈاکیہ دے گیا تھا۔ مسوری میں ڈاک کا انتظام تسلی بخش نہیں۔ بجلی اور گرم پانی کا انتظام بھی اچھا نہیں (بجلی، گرم پانی اور مسوری کی میونسپل کمیٹی کے متعلق ایک صفحہ)۔ میں نے خط کھول کر پڑھا، اگنی ہوتری جی کا اندازِ تحریر بیحد شگفتہ ہے۔ خط پڑھکر جی خوش ہو گیا اور

جب میں خط پڑھ رہا تھا تو عالمِ خیال میں (یا رفعتِ خیال میں) میرے سامنے اگنی ہوتری جی کی مسرت بھری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ (اگنی ہوتری جی کی چمکیلی آنکھوں اور اُن کی شکل و شباہت کے متعلق ایک صفحہ بلکہ اگر ہو سکے تو دو صفحے) اگنی ہوتری جی نے مجھ سے دیباچہ لکھنے کی استدعا کی ہے۔ میں ہیچمداں میرز کس لائق ہوں، اُردو ادب کی خدمت کرتا ہوں۔ اُردو ادب خطرے میں ہے۔ یہی بات میں نے پچھلی کل ہند اُردو کانفرنس میں کہی تھی جس کا میں صدر تھا۔ (پچھلی کل ہند اُردو کانفرنس کی صدارتی تقریر کا خلاصہ دو صفحوں میں) جہاں تک دیباچہ لکھنے کا سوال ہے میں اسے بے معنی سمجھتا ہوں۔ آخر دیباچوں سے اُردو ادب کی حفاظت کب تک ہوتی رہے گی۔ یہی سوال دن رات پریشان کر رہا ہے۔ میری صحت خراب ہو چکی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے (ڈاکٹروں کی رائے ——— رائے بہت خطرناک ہونی چاہیئے۔ ڈپتھیریا۔ انا سیتھزا اور سوم نو مبلزم جیسے خطرناک الفاظ بار بار آئیں ورنہ سارے دیباچے کا مزا کرکرا ہو جائیگا) بہر حال مجھے اگنی ہوتری جی کی خوشی منظور ہے۔ اپنے دوستوں کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلا دیباچہ لکھا تھا۔ (پہلا دیباچہ کب، کیسے اور کن حالات میں لکھا گیا تھا، اس کے بعد اُن تمام دیباچوں کا جستہ جستہ تذکرہ جو بعد میں لکھے گئے، چار صفحے) اگنی ہوتری جی نے مثنوی لکھی ہے۔ اُردو کی پُرانی مثنویوں میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں بہت بلند پایہ ہیں (موازنہ مثنوی مرزا شوق اور گلزار نسیم، پانچ صفحے) یہ مثنوی جو اگنی ہوتری جی نے لکھی ہے بہت خوب ہے۔ (خیالات، محاکات تضمین کی بادشاہی پر ایک فقرہ) بہت ہی کامیاب مثنوی ہے۔ اگنی ہوتری جی ابھی نوجوان ہیں، لیکن ترقی پسند ادیبوں کی طرح بے راہرو نہیں۔ (ترقی پسند ادیبوں کے خلاف جتنے صفحے چاہے لکھ دیجیئے) اگنی ہوتری جی نے اگر اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو ایک دن آسمانِ ادب پر ستارہ بن کر چمکیں گے۔ ہونہار بروا کے

چکنے چکنے پات، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ احقر۔ خواجہ ایم۔ رفیع

"الہلال" مسوری

۱۳ر ستمبر ۱۹۴۱ء

دیکھا آپ نے، اس طرح آپ تیس چالیس صفحوں کا دیباچہ بہ آسانی لکھ سکتے ہیں۔ اسی طریق پر عمل کر کے آپ پچیس پچاس تو کیا پانسو صفحوں کا دیباچہ لکھ سکتے ہیں، اور ابدی شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی کتابوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دیباچے کا حجم تین چوتھائی ہوتا ہے اور اصل کتاب کا حجم صرف ایک چوتھائی (اس میں جلد اور گرد پوش بھی شامل ہیں) یہ بھی دیباچہ نگار کا اعجاز ہے لیکن فن کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے بڑی کدوکاوش کی ضرورت ہے۔

دیباچے کے آخر میں اس جگہ کا نام جہاں پر دیباچہ لکھا گیا ہو، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا دیباچے کے آخر میں "مسوری" کا نام دیباچہ کی زینت کو دوبالا کرتا ہے۔ بصورت دیگر اگر آپ "الہلال" مسوری کے بجائے "چنگیز محلہ لاہور" بازار مائی سیواں، امرت سر" یا کھاری باؤلی دہلی لکھدیں تو دیباچہ دو کوڑی کا ہو جائیگا۔ اور نہ کوئی کتاب پڑھے گا، نہ آپ کا دیباچہ۔ اس لئے دیباچے اور کتاب کی کامیابی کے لئے اپنے تخیل کو وسیع کیجیے۔ اگر آپ لاہور میں رہتے ہیں تو سنی دیو، گلمبرگ، لکھیے امرت سر میں ہوں تو "الہلال مسوری" لکھیے۔ دہلی میں ہوں تو نینی تال لکھیے۔ یعنی جس جگہ آپ رہتے ہوں اُس سے جتنی دُور اور جتنی اونچی جگہ کا نام آپ لکھیں گے آپ کے دیباچے کو اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوگی۔ میں کہتا ہوں آپ "مسوری"" گلمبرگ" بھی آپ کیوں لکھیں۔ آپ بے دھڑک لکھیئے "میری ماڈرن کالج" آکسفورڈ" سٹریٹ فورڈ آن ایوان انگلینڈ"۔ آپ کے دیباچے کو چار چاند نہ لگ جائیں تو میرا ذمہ۔ بڑے بڑے جغادری نقاد بھی آپ کا لوہا نہ مانیں تو میرا نام —— نہیں!

یہ جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے یہ اصل میں دیباچہ ہے میری اس کتاب کا جو میں فنِ دیباچہ نگاری پر لکھ رہا ہوں۔ یہ کتاب مکتبہ ہندوستانی لاہور سے شائع ہوگی قیمت ڈھائی روپیہ فی نسخہ۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ عید، دیوالی اور کرسمس کے دنوں میں یہ کتاب نصف قیمت پر فروخت ہوگی۔ ابھی سے آرڈر بھیجئے، ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

بیوقوفی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور میرا دوست امام دین ایک جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، جنگل خاموش تھا۔ چاروں طرف ایک پرستانی خواب کا سا منظر تھا۔ فرشِ راہ پر چیڑھ کے نکیلے پتوں کے گچھے ایک نرم اور گداز غالیچے کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ پرندے ٹہنیوں پر اونگھ رہے تھے۔ چند بھیڑیں چر رہی تھیں۔ باقی ایک بڑے درخت کے تنے کے نیچے آرام کر رہی تھیں۔ اس بڑے سناٹے میں چشمے کا پانی بھی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا، اس چشمے کے قریب ہی ایک چرواہی اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہی تھی۔

ہمارے بے آواز قدم ہمیں اس سوتی ہوئی حسینہ کے پاس لے گئے۔ یہ جنگل ایک خاموش قلعہ تھا۔ ایک پرستانی قلعہ اور یہ خوبصورت شہزادی جنگل کی شہزادی تھی۔ جو غالباً سو سال سے یہیں سو رہی تھی۔ اُس کی مدھم پُرسکون سانس اسکی چھاتیوں میں ایک مسلسل آہنگ ایک پُرکیف رزش پیدا کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رَواں دَواں رَواں دَواں جیسے ندی بہتے بہتے سو گئی ہو۔ اور اب اسی نیند میں کھوئی ہوئی بہہ رہی

ہو ـــــ خاموشی، سناٹا اور جنگل میں اکیلی لڑکی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ شاید ایک ہی خیال، ایک ہی لمحے، ایک ہی ساتھ ہمارے دلوں میں پیدا ہوا اور ہم دونوں آگے بڑھے ـــــ،

قریب ہی ایک بھیڑ زور سے چلائی باآآآآ۔

لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ دو اجنبیوں کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور اپنی پریشان لٹیں ٹھیک کرنے لگی۔

پھر مسکرا کر بولی: "چشمے سے پانی پینا چاہتے ہو؟"

"جی ارادہ تو ـــــ" امام دین نے کہا۔

لڑکی جلدی سے بولی: "اچھا تو پی لو۔ میری تو یونہی ذرا آنکھ لگ گئی تھی چشمے کے کنارے بہت ٹھنڈک ہوتی ہے نا!"

گو پیاس نہ تھی پھر بھی پانی پینا پڑا۔

جب ہم پانی پی چکے تو لڑکی نے پوچھا:۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم پردیسی ہیں:" امام دین نے معنی خیز نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اور دیس والوں کو پردیسیوں کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے!"

لڑکی نے بھولپن سے کہا: "یہاں سب پردیسی ہیں راہی"

"اُفوہ!" امام دین نے مجھ سے کہا: "یہ تو معرفت کی باتیں کرنے لگی۔ چلو میاں یہاں سے۔ یہاں دال نہیں گلے گی"

لڑکی نے وہ فقرہ کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ اُس نے یوں ہی بے سوچے سمجھے

انتہائی معصومیت اور بیوقوفی کے عالم میں کہہ دیا تھا۔ وہ ہوشیار لڑکی ہوتی، پڑھی لکھی لڑکی ہوتی، سمجھدار لڑکی ہوتی تو یوں جنگل میں اکیلے بھیڑ بکریاں نہ چراتی۔ لیکن وہ تو ایک بیوقوف، نادان، الھڑ دیہاتی لڑکی تھی اور اس کے پاس اپنی حفاظت کے لئے اپنی بیوقوفی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور آخر میں اسی بیوقوفی نے اس کی حفاظت کی۔ یہی بیوقوفی اسکی حفاظت کرتی تھی۔ آج بھی جب جنگل میں دو اجنبی آئے تھے، اسی بیوقوفی نے اس کی حفاظت کی تھی اور بیوقوفی کی وجہ سے کبھی اُس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہوا تھا کہ کبھی کوئی اجنبی جنگل میں اُس کی طرف بُری نیت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ بیوقوف تھی نا بیچاری، اگر وہ عقلمند ہوتی تو ـــــ خیر آپ اخباروں میں اُس کا ذکر پڑھ لیتے۔

بیوقوفی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ لیکن اس سے بھی بیوقوفی کے جوہر اور خواص ہم پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ لوگ اس صفت کو طرح طرح کے ناموں سے پکارتے ہیں، معصومیت، جہالت، احمق، لیکن میں تو اسے بیوقوفی کہوں گا۔

بیوقوفی کو لوگ بہت بُرا کہتے ہیں۔ بُرا سمجھتے ہیں، اس سے نفرت کرتے ہیں، اس پر ہنستے ہیں۔ بخلاف اس کے آج کل عقل کی پرستش کی جاتی ہے، عقل بڑی چیز ہے، عقل کا دُنیا پر راج ہے، اِس دُنیا پر بھی اور اُس دنیا پر بھی۔ فلاں شخص بیوقوف ہے، وہ احمق ہے، وہ جاہل ہے، اسے دُنیا میں کوئی مرتبہ نہ ملنا چاہیئے۔ فلاں آدمی بڑا عقلمند ہے، زیرک ہے، دانشور ہے۔ اسے چہار دانگ عالم کی بادشاہت سونپ دو۔ کچھ اس قسم کی تفریق عقلمندی اور بیوقوفی کے درمیان قائم کر دی گئی ہے کہ اب ہر انسان عقلمند کا سہارا ہی پسند کرتا ہے۔

سیاست داں عقلمند ہوتا ہے، شاعر بیوقوف ہوتا ہے، سماج کی لکیر پر چلنے والا عقلمند ہوتا ہے، عاشق بیوقوف ہوتا ہے، اپنے دماغ کے بوتے پر مل چلانے والا سرمایہ دار عقلمند ہوتا ہے، اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرنے والا مزدور بیوقوف ہوتا ہے۔ ناچ گھر میں تھرکتی ہوئی ریشمی

لباس میں ملبوس لڑکی عقلمند ہوتی ہے. جنگل میں بھیڑ بکریاں چرانے والی چرواہی. بیوقوف ہوتی ہے.

عقلمند اور بے وقوف!

عقلمند ہمیشہ بیوقوف پر ہنستا ہے.

سیاست داں شاعر پر، سماج پرست عاشق پر، سرمایہ دار مزدور پر اور تعلیمیافتہ لڑکی چرواہی پر.

عقلمند اور بیوقوف!

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے. کیوں بیوقوفی کو بُرا سمجھا جاتا ہے. دُنیا کی خوبصورت ہنسی کا منبع بیوقوفی ہے. اگر دُنیا میں بیوقوفی نہ رہے تو خوبصورت لوگ کس پر ہنسیں گے. ظاہر ہے کہ وہ اتنے بیوقوف نہیں جو اپنے آپ پر ہنسیں. کیونکہ اپنے آپ پر ہنسنے کے لئے بھی بیوقوفی کا عنصر چاہیئے، جو عقلمند لوگوں میں ناپید ہے. چارلی چپلن کی عظمت کا راز اُس کی مضحک، احمقانہ، بیوقوف حرکات میں ہے. وہ خود نہیں ہنستا، لیکن اپنی بیوقوفی سے ساری دُنیا کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے. اور اگر دُنیا میں قہقہے نہ رہیں، بلصورت دیگر اگر دُنیا میں بیوقوف آدمی نہ رہیں تو یہ دُنیا ایک نغمۂ شادی سے ایک نوحۂ غم میں مبدّل ہو جائے. دُنیا کی خوشی کے لئے، مسرّت کے لئے، ہنسی کے لئے بیوقوفی کا وجود ناگزیر ہے.

ہنسی اور مسرّت کے علاوہ خوبصورتی کا منبع بھی بیوقوفی ہے. عورت جتنی خوبصورت ہو اتنی ہی بیوقوف ہوتی ہے. حُسن اور عقل کا ہمیشہ بیر رہا ہے. خوبصورت چیز کبھی عقلمند نہیں ہوتی. حسین عورت، چھٹکی ہوئی چاندنی، گلاب کی مُسکراتی ہوئی پتی، کبھی کسی نے ان کو عقلمند پایا ہے. پھر نہ جانے کیوں لوگ عقلمندی پر جان چھڑکتے ہیں. حُسن، ہنسی، مسرّت، سچائی، دُنیا

کی کسی اچھی چیز میں عقل نہیں ہوتی. پھر بھی یہ لوگ عقل کے پیچھے دیوانے ہیں۔ احمق کہیں کے، میرا مطلب ہے عقلمند کہیں کے۔

وہ سوال آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ "عقل بڑی کہ بھینس؟" "میں تو ہمیشہ بھینس کو ترجیح دوں گا۔ ہر حالت میں بھینس عقل سے بڑی ہے۔ بھینس دودھ دیتی ہے، مکھن اور چھاچھ اور پنیر، اُس کی ہڈیوں سے کھاد تیار ہوتی ہے۔ اُسکے سینگوں سے بٹن اور چاقوؤں کے دستے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کی کھال سے جوتے۔ بھینس ہر حالت میں زندگی اور موت میں عقل سے بڑی ہے۔ اُس کا رُواں رُواں انسان کو فیض پہونچاتا ہے۔ اور عقل؟ عقل نے آج تک انسان کے لئے کیا کیا؟ بول بول اے رقص گاہ میں ناچتی ہوئی لڑکی! ذرا اس جنگل میں جاکر اپنے حُسن کا اس چرواہی کی خوبصورتی سے مقابلہ کرکے تو دیکھ۔ اپنے اُلجھے ہوئے پریشان ذہن کا اس چرواہی کی ذہنی شگفتگی، بے ساختہ پن اور بیوقوفی سے مقابلہ کر، پھر تجھے پتہ چل جائے گا کہ عقل بڑی یا بھینس؟

سرمایہ دار ہمیشہ مزدور پر ہنستا ہے۔ بیوقوف، جاہل۔ مجھے دیکھو میں اپنی عقل سے ان لاکھوں مزدوروں کا حاکم ہوں، یہ کارخانہ چلاتا ہوں۔ میری آمدنی لاکھوں روپوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس مزدور کو چند ٹکے ملتے ہیں۔ کیونکہ یہ بیوقوف ہے۔ اگر میری طرح عقلمند ہوتا تو اس کی یہ دُرگت نہ ہوتی۔ عقل ہر حالت میں افضل ہے۔ سماج پرست ہمیشہ عاشق پر ہنستا ہے۔ میری بیوی ہے، بچے ہیں۔ گھر ہے، رشتہ دار ہیں، دُنیا میں عزّت ہے۔ مرنیکے بعد جنّت ٹھکانا ہے، اور تو باغی، منحرف، جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ مجنوں! تیشہ لیکر چٹانیں کاٹتا ہے۔ کچّے گھڑے پر چناب عبور کرنا چاہتا ہے۔ بیوقوف، جاہل، عاشق، نہ تیری نیند اپنی ہے نہ راتیں۔ نہ تجھے اس دنیا میں آرام حاصل ہے نہ عقبیٰ کی فکر۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ بیوقوف!

سیاست داں ہمیشہ شاعر پر ہنستا ہے۔ میں کام کرتا ہوں یہ شعر کہتا ہے، میں دُنیا

کا نظام چلاتا ہوں یہ خواب دیکھتا ہے۔ میں بلند عمارتیں کھڑی کرتا ہوں یہ درخت کے سائے تلے سوتا ہے۔ میں قوم کی تقدیر بدلتا ہوں، یہ کتاب کے ورق اُلٹتا ہے، جاہل، بیوقوف، بے مصرف!

عقلمندوں کے استدلال کا جواب بیوقوف کے پاس کیا ہوگا۔ وہ تو ہر حالت میں بیوقوف ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ انسان نے سینکڑوں سال سے اپنی قسمت عقلمند آدمیوں کو سونپ رکھی ہے لیکن ان عقلمند آدمیوں نے آج تک انسانی خوشی مسرت اور حُسن میں ایک لمحہ کا اضافہ بھی نہیں کیا۔ جُوں جُوں عقلمندی بڑھتی ہے سماج کا دائرہ تنگ ہونے لگتا ہے اور ناچ گھر کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے۔ طوائفیت پھیلتی ہے، عشق مرتا ہے۔ قوموں میں جنگیں ہوتی ہیں۔ کارخانوں میں ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر عقلمند سرمایہ دار چاہتا ہے کہ اس کا کارخانہ ہر سال سے زیادہ منافع حاصل کرے۔ اسی انفرادی کوشش میں مزدوروں کی حالت زبوں ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ عقلمندی ان جاہل مزدوروں کو انقلاب کا درس دینے لگتی ہے۔ اس طرح ہر عقلمند سیاست داں یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم ترقی کرے اور دُنیا کی سب قوموں سے بازی لے جائے لیکن زمین ایک ہے اور اس کرۂ زمین کی جغرافیائی حدود ہیں، اس لئے یہ عقلمندی قوموں میں پیکار اور جنگ کا نقشہ دکھاتی ہے اور ہر پچیسویں سال نئی جوان نسل، انسانی نسل خاک وخون کے بستر پر لوٹتی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ دُنیا میں عقلمند، سیاست دانوں کا راج ہے، شاعروں کا نہیں۔ سماج پرستوں کا غلبہ ہے عاشقوں کا نہیں۔ ناچ گھر میں ناچتی ہوئی لڑکیوں کا اثر ہے چرواہیوں کا نہیں۔ سرمایہ داروں کا حکم ہے مزدوروں کا نہیں۔ سینکڑوں برس انسانیت نے ان عقلمند سیاستدانوں، جاگیرداروں، سرمایہ پرستوں، سماج کے ٹھیکیداروں اور طوائفیت میں پلی ہوئی حسیناؤں کی دانش کا تجربہ کیا ہے۔ اگر اب چند دنوں کے لئے احمق شاعروں، عاشقوں، مزدوروں اور چرواہیوں کی بیوقوفی کا بھی تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے تو کیا ہرج

ہ۔ سیکڑوں سال سے ہم لوگ عقلمندوں کی رہگذر پر چلے آرہے ہیں۔ اگر دو گھڑی بیوقوفی کی جھاڑی میں دم لے لیں تو کیا ہرج ہے۔

احمق کہیں کا۔ بیوقوف!

یہ سچ ہے کہ میری تجویز احمقانہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی تو سچ مچ جی چاہتا ہے کہ اس عقلمندی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لیکن پھر سہم کر رہ جاتا ہوں، کیوں کہ اس دُنیا میں بڑے بڑے عقلمندوں کا راج ہے ——— اور ———!

کاش دُنیا کے سب لوگ بیوقوف ہوتے!

ایک حبشی بمبئی میں

خوبصورت، بلند قامت مغربی عمارتیں، ہر ایک عمارت میں ہزاروں انسانوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں، جنہیں عمارتوں میں گھونسلے بنانے کی اجازت نہیں، یا توفیق نہیں، وہ باہر فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ دکانوں کے بڑھے ہوئے لکڑی کے پائیدان کے نیچے، محرابی پلوں کے نیچے، جامن، آم، سنگترے اور اکادکے درختوں کے نیچے، غرضکہ ہر اُس شے کے نیچے جہاں پرندے بھی اپنا گھونسلہ بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن پرند اور انسان میں یہی فرق تو ہے۔ پرند آفاقی ہے، انسان ارضی۔ پرند آسمان کی پنہائیوں میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔ انسان زمین کی گندی موری میں گھس جانا چاہتا ہے، خدا جانے اُسے کس بات کا ڈر ہے، کس سے وہ اس قدر شرم محسوس کرتا ہے، کہ کبھی آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، بلکہ گندے چیتھڑے لپٹائے، اپنے فاقہ زدہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا، کسی محرابی پل کے نیچے کسی ایسے تنگ و تاریک کونے کو تلاش کرتا پھرتا ہے جس کی غلاظت اور تعفن میں وہ اپنا سر چھپالے، اور تاروں کی نگاہوں، اور مون سون کی خنک ہوا، اور چاند کی گہری دھندلی چاندنی سے اُس خوفناک ارادے

کا اظہار نہ کر سکے جو ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے چھپا ہوا ہے۔ مستور بھی ہے اور ظاہر بھی ہے، لیکن جس کا اقرار اُس کے لئے اس قدر مشکل ہے کہ اس کا ضمیر ہر وقت پراگندہ رہتا ہے، اُس کی رُوح پریشان اور جسم کا ہر تار ایک دُکھتا ہوا زخم۔ کاش وہ کبھی تو قبول لے۔ ایک بار کھُل کر اس ازلی دُشمنی اور نفرت کو اپنے آپ ظاہر کر دے۔ جو اسے دوسرے انسانوں سے ہے۔ شاید اسی اقرارِ جرم سے وہ جی اُٹھیگا" اُس کی رُوح سبک بار ہو جائے گی۔ اور اس کے جسم سے وہ گندے چیتھڑے اس طرح جھڑ جائیں گے، جیسے درخت سے پُرانی چھال۔ اور وہ زندہ و تابندہ ہو جائیگا۔ لیکن وہ یہ کیسے کرے۔ وہ تو ہر وقت کسی تاریک و تنگ کونے کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ تاروں کی نگاہوں کا پیغام نہیں سننا چاہتا۔ وہ رومانی نہیں حقیقت پسند ہے۔

.... اور جو لوگ بمبئی کے بلند گھونسلوں میں رہتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی اپنے جسموں کے گرد چار دیواری کھڑی کر لی ہے۔ اور اس چار دیواری کو مختلف ساز و سامان سے بھر لیا ہے۔ اس طرح کہ حرکت کرنا مشکل ہو جائے۔ وہ واقعی حرکت کرنا نہیں چاہتے، اوّل تو یہ چار دیواری ہے، پھر اس میں پلنگ ہے، میز ہے، کرسیاں ہیں، صوفے ہیں، کتابوں کی الماریاں ہیں، چھوٹی چھوٹی بے شمار اشیاء ہیں جو انسان کو حرکت سے روکتی ہیں۔ اُسے سوچنے سے روکتی ہیں۔ اُسے سب پھندے تُڑا کر بھاگنے سے روکتی ہیں۔ وہ بلند گھونسلے میں رہتا ضرور ہے۔ لیکن اُس کے دماغ میں بھی ایک ایسی لفٹ لگی ہوئی ہے جو اُسے اُوپر لے جانے کے بجائے اُسے ہمیشہ اُسی تاریک کونے کی طرف لے جاتی ہے، جہاں اک گندے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا انسان دُنیا و مافیہا سے بیخبر پڑا ہے۔ اُس کے دل کا چور، اُس کی رُوح کی خوفناک کشمکش، اُس کے ہاتھ کی انگلیوں کا پیہم اضطراب، ہر لحظ اس خاموش جنگ کا پتہ دیتا ہے جو اس کی ہستی کے حدودِ اربع میں جاری ہے۔ قبولو۔ نہیں میں ہر گز نہیں قبولوں گا۔ میں ایک شریف انسان ہوں۔ اچھا، سب سے

اچھا انسان۔ میں نے کسی دوسرے انسان پر کبھی کوئی ظلم نہیں کیا۔ اگر میں ایک بلند گھونسلے میں رہتا ہوں تو یہ گھونسلا میں نے اپنی محنت سے بنایا ہے۔ اپنی محنت اور عقل سے۔ ریس اور سٹے سے۔ نہیں نہیں، میں ہرگز نہیں قبولوں گا۔ اور پھر وہ پریشانی سے ٹیلیفون کے رسیور کو پکڑ لیتا ہے" ہیلو ہیلو۔ ڈارلنگ۔ ہاں کہیں چلو۔ ضرور چلو۔ سنیما یا جوہو؟ آج طبیعت پریشان ہے۔ جی نہیں لگ رہا۔ ہاں، ہاں وسکی ضرور ہوگی۔ غم غلط ہو جائیگا؟" سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کونسا غم ہے جو ہر انسان کے جی کو لگا ہوا ہے۔ جو ہر وقت اُسے پریشان رکھتا ہے۔ بلند گھونسلوں میں رہنے والوں کو بھی پریشان کئے رکھتا ہے......

خدا کے لئے ایک بار بتا دو۔ دیکھو پھر کیا ہوتا ہے.....

بمبئی کے تین طرف سمندر ہے اور ایک طرف کارخانے۔ یا تین طرف کارخانے اور ایک طرف سمندر۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان چہار اطراف پر کارخانے والوں کا قبضہ ہے۔ پہلے پہلے سمندر بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ نیلا نیلا، آسمان کی طرح معصوم۔ خوشی سے گنگناتا ہوا۔ کسی الھڑ دوشیزہ کے گیت کی طرح۔ لیکن ایک عرصے کے بعد اُس کی سب ادائیں، اس کے عشوے، نازو نخرے، مصنوعی جعلی اور پُرفریب معلوم ہوتے ہیں۔ بمبئی کا سمندر بمبئی کے کارخانے داروں کی طوائف ہے۔ اس کے گرد کنکریٹ کے بنچوں کا جنگلہ ہے۔ جہاں بیٹھ کر لوگ اُسے دیکھتے ہیں، اور اس کے رقص سے محظوظ ہوتے ہیں۔ تیرنے کی خاص جگہیں ہیں۔ جہاں آدمی پیسے خرچ کر کے تیر سکتا ہے، ایک جگہ پر ہندوستانی نہیں تیر سکتے۔ ایک جگہ پر صرف ہندو تیر سکتے ہیں۔ ایک جگہ پر صرف پارسی، سمندر کارخانے داروں کے جہاز اپنی چھاتی پر تیرا کر لاتا ہے۔ کنارے کنارے بڑے بڑے گودام ہیں۔ جہاں مال کی حفاظت ہوتی ہے اور پھر کسٹم کی چوکی ہے۔ اور پولیس کے سپاہی ہیں۔ ایک جگہ گیٹ آف انڈیا ہے۔ یعنی ہندوستان کا دروازہ۔ یہ دروازہ تاج محل ہوٹل کے بالکل قریب ہے۔ لیکن اب اس دروازے کو بھی لوہے کے تالوں سے

بند کر دیا گیا ہے، اور اب یہ خوبصورت سمندر ایک ڈیرے دار طوائف بن کر رہ گیا ہے، امراؤ جان ادا......

بمبئی میں بڑی حرکت ہے، زندگی ہے، اضطراب ہے، بھاگتی ہوئی موٹریں ہیں جو پٹرول راشننگ کے باوجود دن میں سینکڑوں میل کا چکر لگاتی ہیں۔ بسیں ہیں، لاریاں ہیں، ٹرامیں ہیں۔ لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں۔ کیوں کہ کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ نگاہ اٹھا کر کسی دوسرے انسان کو پہچان لے۔ بہت سے لوگ بمبئی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ ہائے کس قدر بے بسی ہے، اس تنہا انسان کی، اپنی تنہائی اور بے بسی اور بیچارگی کو بھی ایک خوبی سمجھ لیا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھونسلے کی فکر میں ہیں۔ اشتراک کا فقدان آزادی کی تشنگی کو بجھانے کے لئے مجبور ہے۔

لیکن یہ حرکت محض چند میلوں تک ہے۔ مینڈک کے کنوئیں کی طرح بمبئی کی چار دیواری بھی بےحد محدود ہے۔ کارخانے اور سمندر، اور اس چار دیواری کے اندھے کنویں میں لاکھوں انسان شب و روز مینڈک کی طرح خوشی سے چکر لگاتے ہیں۔ دادر سے چوپاٹی اور چوپاٹی سے کلے اسکوائر تک گھومتے ہوئے اس حرکت پر بڑے مسرور ہوتے ہیں۔ وہ ایک وسعت ہے۔ کیا کشادہ سڑکیں ہیں۔ کیسی عمدہ صفائی ہے، دکانوں پر بڑی بڑی شیشے کی الماریاں سجی ہیں۔ بس یہ کنواں ہماری کائنات ہے اسکے بعد دنیا ختم اور کائنات خاموش.....

بمبئی کی سوغات ہے فلم، سٹہ، کارخانے، ریس اور چائے۔ بمبئی میں ہر ذی ہوش چائے پیتا ہے۔ فلم دیکھتا ہے، ریس پر جاتا ہے۔ اور کارخانے میں کام کرتا ہے، یا کام نہ کرتے ہوئے بھی کسی کارخانے کا مالک ہے۔ یا ان کے منافع کا شریک

ہے۔ بمبئی میں ہر چوتھی دوکان چائے کی دُکان ہے، ہر آٹھواں گھر سینما گھر ہے، ہر بارھواں فرد فلم ایکٹر ہے یا فلم ایکٹر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور سٹہ اور ریس تو زندگی کے ہر شعبے میں چھائے ہوئے ہیں۔ جب تک دن میں بمبئی والا ایک بار ریس نہ دیکھ لے، یا سٹہ نہ کھیل لے، وہ رات کو سو نہیں سکتا۔ اور اکثر یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی سو نہیں سکتا، کیوں کہ ابھی اُسے کل کے سٹہ کی فکر کرنا ہے۔ رات کسی میں فلم دیکھنا ہے جس کا ہیرو اس کے آئینے کی طرح جھوٹا ہے۔ اور جس کی ہیروئن اُس کے خوابوں کی طرح باوفا اور حسین۔ اور پھر چائے۔ چائے۔ چائے لادو۔ اور چائے لادو۔ بمبئی والے کی جنت میں چائے کی نہریں بہتی ہیں اور روشوں پر فلم ایکٹرنسیں محوِ خرام ہیں۔ اور ہر وقت ریس لگی رہتی ہے، گولڈن ایرو، ڈیل ٹوٹ، بہرام پیلیٹ، واہ، واہ، اس جاکی نے تو غضب کر دیا...... اور کارخانے۔ بمبئی والوں نے جن جنتی کارخانوں کا تصور کر رکھا ہے۔ اُن کی چمنیوں سے کبھی دُھواں نہیں نکلتا۔ ان پر ایک پیسہ بھی اپنی گرہ سے خرچ نہیں کیا جاتا، مزدور کبھی اسٹرائک نہیں کرتے۔ اور چُپ چاپ سارا منافع کارخانے کے مالک کے قدموں پر ڈھیر کر دیتے ہیں......

گو بمبئی میں لوگ ایک دوسرے کو مطلق نہیں پہچانتے۔ لیکن یوں وہ سب بھائی بھائی ہیں۔ شاید صحیح اخوت یہی ہو کہ ایک انسان دوسرے انسان کو نہ پہچانے۔ اسی لئے تو بمبئی میں ہر شخص نے اپنے نام کے آخر میں بھائی لگا رکھا ہے۔ یہ جوسف بھائی ہیں، یہ جعفر بھائی ہیں، یہ جمشید بھائی ہیں، یہ سارا بھائی ہیں، یہ آدھا بھائی ہیں۔ یہ اُلٹا بھائی ہیں، یہ سیدھا بھائی۔ مگر ہر فرد بھائی ضرور ہے۔ وہ آپ کو پہچانے گا نہیں۔ چائے تک نہیں پلائے گا۔ جس سڑک پر آپ چلے جا رہے ہیں اُس کا نام تک نہ بتائے گا۔ اگر ہو سکے تو آپ کی جیب تک کاٹنے کو تیار ہو گا۔ مگر وہ آپ کا بھائی ضرور ہے۔ آپ کا جوسف بھائی یا جاکی بھائی۔ بمبئی کا بھائی ہر اُس شخص کے لئے جو بمبئی میں پہلی بار وارد ہوتا ہے ایک

اچنبا ہے اور شاید ایک مصیبت بھی!۔
بمبئی والوں کے دو تکیہ کلام ہیں۔ چالو، اور خلاص۔ یہاں ہر چیز چالو ہے یا خلاص۔
کیوں صاحب یہ فیتہ بوٹ باندھنے کا آپ کے خیال میں کیسا رہے گا؟ "چالو"۔ یہ فلم کیسا ہے "چالو"۔ یہ فلم ایکٹریس کیسی ہے؟ "چالو"۔ یہ ڈاکٹر کیسا ہے؟ "چالو"۔ رات کے دس بجے جب بمبئی پر بلیک آؤٹ کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے، صرف کہیں کہیں بجلی کی بتی کسی مجرم کی آنکھ کی طرح کسی خوفناک ارادے کا اظہار کرتی ہے۔ آپ سنیما سے لوٹتے ہوئے کسی قریب کے ہوٹل میں گھس جائیے۔
"آئیے بھائی"۔ ہوٹل والا اپنے چہرے اور اپنی گھنی مونچھوں پر ایک مشفقانہ تبسم پھیلاتے ہوئے کہے گا۔
"کھانا چاہیئے بھائی"۔ آپ بھوک سے بے تاب ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بلکہ گرتے ہوئے کہیں گے۔

"خلاص"۔ (بمنزلہ نفی)

"اچھا تو چائے ہوگی"۔

"خلاص!"

"کافی ہے"۔

"خلاص!!"

"آلو کا بھُرتا ہے"۔

"خلاص"۔

اگر آپ کسی بمبئی والے سے اچانک سوال کر بیٹھیں۔ کیوں صاحب خدا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، تو اگر اُس نے ریس یا سٹے میں کچھ جیتا ہے تو کہے گا "چالو" ورنہ "خلاص"۔ کیوں کہ خدا تو ہر شخص کا ذاتی ہوتا ہے۔ اور بمبئی والوں کے خدا کی شکل تو ریس کے کسی دُبلے

پتلے پچکے ہوئے گالوں والے گنجے جاگی سے ملتی جلتی ہے!

بمبئی میں تجارت ہوتی ہے، محبت نہیں ہوتی۔ ایکٹر ہوتا ہے، آدمی نہیں ہوتا۔ لفٹ ہوتی ہے، گھر نہیں ہوتا۔ بمبئی ایک عجیب جگہ ہے، یہاں ہندوستان کے سب مذہب، سب قومیں، سب لباس، سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بمبئی کی کوئی ایک زبان نہیں۔ ایک تمدن نہیں۔ ایک روح نہیں۔ وہ ہندوستان کا مرکز ہے۔ اور اس کی ملنساری، اس کے نفاق، اور اس کی عظیم ذلت کا پرشکوہ منظر...... جب بلیک آؤٹ ہوتا ہے اور جوسف بھائی کی آنکھ بند ہوتی ہے اور بند گھونسلوں میں بجلی کی بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ اور سمندر کے کنارے کسی پرشکوہ ہوٹل میں ایک بیکار سیٹھ اپنے شرابی سانس کو کسی خریدی ہوئی فلم ایکٹرس کے رخساروں پر دھونکنی کی طرح بکھیرنے لگتا ہے۔ اُسی وقت سمندر کے کنارے میرین ڈرائیو کی بسیط فضا میں کسی بھوکے بلکتے ہوئے فقیر بچے کی جگر خراش چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ بھوکا ہے، اس کی نیپالی ماں بھوکی ہے۔ اور غیظ و غضب میں آکر وہ اُسے بے تحاشہ پیٹنے لگتی ہے۔ کیوں کہ آگ اور پانی اور ہوا، اور روٹی، اور تن ڈھانکنے کے لئے چھال۔ یہ سب چیزیں جو پہلے قدرت مفت مہیا کرتی تھی۔ اب قانون اور سرمایہ کے جیل میں بند کر دی گئی ہیں۔

"ماں لوتی"

"چُپ سؤر"

"ماں لوتی"

"چُپ حرامی لنگور"

"ماں لوتی"

"چُپ لنجے، گیدڑ"

نیپالی بھکارن گورکھی زبان میں اپنے بچے کو مخصوص صلواتیں سنا رہی ہے، اور

یکایک مجھے احساس ہوتا ہے انسان کی ابھی صرف دُم جھڑی ہے۔ میں بدستور وحشی ہوں، ایک جاہل، بے عقل حیوان جس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنا درک، اتنا سلیقہ، اتنی خوش معاملگی بھی نہیں ہے جتنی چیونٹیوں کے گروہ میں یا ہرنوں کے گلے میں۔

بمبئی انسانوں کا شہر نہیں ہے۔ وہ ایک جنگل ہے۔ ایک خوفناک وحشی جنگل، جس میں چیتے، لنگور، گیدڑ، سانپ، لومڑیاں، بھیڑیے، بستے ہیں۔ اور اس جنگل کی خوفناک تنہائیوں میں وہی اکیلی، المناک صدا

ماں روتی! ماں لوتی!!

خلاص!!!

وٹامن

کہتے ہیں وٹامن زندگی کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا انگریز کیلئے ہندوستان
پہلے پہل وٹامن صرف دو قسم کا ہوتا تھا۔ وٹامن الف اور وٹامن ب۔ لیکن اب تو وٹامن
نے سارے حروف تہجی اپنا لئے ہیں، اور اگر وٹامن کی تخلیق کو بروقت روکا نہ گیا۔ تو عین
ممکن ہے کہ ان کے لئے ایک نئے حروف تہجی کی تشکیل کرنا پڑے۔

دنیا میں مجھے جن چیزوں سے نفرت ہے، اُن میں وٹامن بھی شامل ہیں۔ بلکہ
یوں کہیئے کہ ان سب چیزوں میں وٹامن شامل ہیں۔ مثلاً کریلے! کیسے کڑوے، کسیلے
ہوتے ہیں۔ شکل دیکھئے۔ کیسی بے ہنگم، میلا سبز رنگ، سڑا ہوا جسم، جس پر ہزاروں بدنما
داغ جیسے کریلے کو کوڑھ یا چیچک ہو گئی ہو! ٹماٹر بھی وٹامن کا سالا بنا پھرتا ہے، ایسا
چار سو بیس اور دھوکے باز پھل آپ کو دُنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ شکل و صورت
بھولی بھالی، ایک معصوم بچے کی طرح سُرخ و سپید، دور سے بالکل کشمیری سیب یا
آلو بخارا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سونگھئے، تو ایسی بدبو آتی ہے، جیسے آدمی سات دن
سے نہایا نہ ہو، ٹماٹر نہ سیب کی طرح میٹھا نہ آلو بخارے کی طرح ترش ہوتا ہے، بلکہ

اس میں ایک عجیب نمکین بجساسا رس ہوتا ہے۔ جس میں زرد زرد دانے کیڑوں کی طرح کلبلاتے پھرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ خدا جانے لوگ ٹماٹر کیسے کھاتے ہیں؟

اور پھر کدو میں بھی وٹامن ہوتا ہے، کدو کو دیکھ کر میرے ذہن میں ہمیشہ بنئے کے پیٹ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بڑھا ہوا پیٹ، پھولا ہوا پیٹ، سود در سود، سرمایہ داری، استعماریت، جنگ، یہ تمام کڑیاں، جنہوں نے بنی نوع انسان کے گرد ایک فولادی جال بُن رکھا ہے۔ میرے ذہن کے دُھندلکوں میں چمکنے لگتی ہیں۔ اور میں ان کی تخلیق کی تمام تر ذمہ داری کدو پر رکھتا ہوں۔ اوّل تو یہ بنئے کے پیٹ کی طرح اس قدر بدصورت ہوتا ہے کہ اُسے خریدنے کو جی نہیں چاہتا، اور پھر یہ اس قدر طویل و عریض ہوتا ہے کہ نہ سبزی کی ٹوکری میں آسکتا ہے، نہ جھولے میں ڈالا جا سکتا ہے، نہ سائیکل کے آگے لٹکایا جا سکتا ہے۔ اب اس کے لئے ایک چھکڑا لیجئے۔ اُسے تانگے کی سواری کرائیے۔ لیکن وہاں بھی ہر لحظہ اس کے گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اب ان تمام صعوبتوں کے بعد گھر جا کر اس کے ٹکڑے کیجئے۔ تو اندر سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ باہر دیکھنے میں جتنا موٹا ہوتا ہے اندر سے اتنا ہی خالی ہوتا ہے۔ صرف چند سُکڑے ہوئے بیج، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بیج کناروں پر لگے ہوتے ہیں اور بس۔ کھائیے کدو۔ اور کیجئے تعریف اُس خدا کی ......

کدو کا ذائقہ؟ ...... ذرا یہ سالن چکھئے ...... نہ نمکین نہ شیریں، بلکہ یوں کہئے کہ شیریں بھی ہے اور نمکین بھی ہے، مجھے ایسی اشیاء اور ایسے افراد مطلق پسند نہیں آتے۔ جو یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ انہیں زندگی میں کیا کرنا ہے، وہ شیریں بننا چاہتے ہیں یا فرہاد ...... میرا مطلب تھا یا نمکین؟ وہ فسطائیت پسند کرتے ہیں یا جمہوریت؛ آزادی کی تحریک کے حامی ہیں یا اس کے مخالف؟ لیکن بعض افراد عمر بھر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے، ان کی یہ دو رُخی، دورنگی، تذبذب کی پالیسی ہمارے تمدن میں سوشل ڈیموکریٹ فلسفہ پیدا کرتی ہے، ہمارے سماج میں سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں تعمیر کرتی ہے۔

کدو ترکاریوں میں سوشل ڈیموکریٹ ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ ہر سوشل ڈیموکریٹ کدو ہوتا ہے۔ پیٹ بڑھا ہوا۔ دماغ خالی، رُوح رجعت پسند!

بینگن! زبان پر بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟ بینگن کی تعریف میں ہندی شاعروں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ اس کا سانولا سلونا شام رنگ، اس کی ملاحت، اس کی ملائمت، اس کی موہنی سبزی ترکاریوں میں اسکی وہی حیثیت ہے جو چار ذاتوں میں برہمن یا سیّد کی ہوتی ہے۔

مَیں بینگن کے خلاف نہیں، اگر کچھ اور کھانے کو نہ ملے تو مَیں اِسے کھالیتا ہوں، بھوکا نہیں رہتا۔ باغیچے میں بینگنوں کو چھوٹے چھوٹے پَودوں سے لٹکے ہوئے دیکھ کر مجھے ہمیشہ خدا کی رحمت کا احساس ہوتا ہے، لیکن معاف کیجیئے، مجھے اس کا رنگ پسند نہیں، بہت کم بینگن سانولے سلونے ہوتے ہیں۔ اکثر جامنی بلکہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں، اور اس کی لمبوتری شکل تو بالکل کسی مدقوق مریض کے چہرے کی طرح، اور ڈنڈی پر اس قدر کانٹے ہوتے ہیں کہ ملائمت کا نام تک نہیں ہوتا۔ شکل تو خیر لمبوتری تھی۔ لیکن ڈنڈی بھی اتنی لمبی ہے کہ دُور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے چوہے کو پھانسی پر لٹکا رکھا ہے۔ بیج اس قدر بدذائقہ ہوتے ہیں کہ نہ کھائے جا سکتے ہیں نہ اُگلے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی یہ دعویٰ ہے کہ مَیں وٹامن سے بھرپور ہوں۔ کبھی کبھی یہی سوچ کر جی چاہتا ہے کہ وٹامن کہیں اکیلا مل جائے تو اُسے کچّا ہی چبا ڈالوں۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ وٹامن کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی چیز میں شامل رہتا ہے۔

بھنڈی کو بھی آپ جانتے ہوں گے، ہر دوسرے تیسرے روز میز پر دھری ہوتی ہے۔ روکھے سوکھے ٹکڑے جیسے کسی بدنما آنت کے قتلے اور اگر بھنڈی سالم پکائی جائے تو اس کی چپچپاہٹ سے متلی ہونے لگتی ہے اور اگر گوشت میں ڈال کر کھائی جائے تو سارے شوربے کو لیسدار بنا دیتی ہے لوگ اُسے رغبت سے کھاتے ہیں اور حکیم لوگ

اکثر بے اولاد مریضوں کو بھنڈی کھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ تاکہ ہندوستان میں وہ جو چالیس کروڑ چوہے بستے ہیں ان میں چند اور مریل چوہوں کا اضافہ ہو جائے۔ دراصل بھنڈی کھانے کی نہیں گوند کی طرح چپکانے کی چیز تھی۔ مناسب تو یہی تھا کہ بھنڈی کے لیس سے گوند دانیاں بھری جاتیں اور ہندوستان میں ایک نئی صنعت کا آغاز ہوتا۔ لیکن لوگ ہیں کہ وٹامن اور کثرتِ اولاد کے شوق میں برابر بھنڈی کھائے جا رہے ہیں، اور نہیں جانتے کہ ہندوستان کی غلامی اور صنعتی پستی کی کیا وجہ ہے؟

جتنی نفرت مجھے ترکاریوں سے ہے اتنی محبت مجھے پھلوں سے ہے۔ پھلوں میں سیب، انگور، انار، ناشپاتی اور نارنگی بہت پسند ہیں۔ مدتوں میں یہی جان کر پھل کھاتا رہا کہ ان میں وٹامن شامل نہیں۔ لیکن ایک دن ڈاکٹر نے مجھے یہ منحوس خبر سنائی کہ پھلوں میں بھی وٹامن ہوتا ہے۔ لیجئے وٹامن نہ ہوئے جان کے لاگو ہو گئے۔ ربِّ عظیم کی طرح جہاں جائیے جو کھائیے موجود ہیں۔

اتفاق سے میں اس وقت سیب کھا رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا: "صاحب براہ کرم یہ بتا دیجیے کہ وٹامن سیب کے کس حصے میں ہوتے ہیں۔ وہ حصہ کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے نہایت متین لہجہ میں کہا: "سیب کے چھلکے میں۔ سیب کو چھیل کر نہیں چھلکوں سمیت کھانا چاہیئے۔"

پہلے تو میں یہ سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ وٹامن کھانے کی چیز ہے اس کا جزو ضروری ہے لیکن یہ اکثر ایسی جگہوں پر پایا جاتا ہے جو کھائی نہ جا سکیں۔ مثلاً وٹامن سیب کے گودے میں نہیں سیب کے چھلکے میں ہوتا ہے، ناشپاتی کے خول میں ہوتا ہے۔ سنگترہ کے ریشوں میں، آم کے روئیں میں۔ بوضکہ پھل کے اُس حصہ میں ہوتا ہے جو عموماً بد ذائقہ، کرخت اور برا ہوتا ہے، وٹامن کی پستی مذاق

کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ وٹامن نہ صرف پھلوں اور ترکاریوں میں بلکہ غلّہ اور دالوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن وہاں بھی ایسی ہی جگہ پر ہوتا ہے۔ یہ چاول میں نہیں چاول کے خول میں رہتا ہے، بادام کے بجائے اگر بادام کے چھلکے خرید لئے جائیں تو زیادہ وٹامن حاصل ہوتا ہے، وٹامن گیہوں کے مغز میں نہیں گیہوں کے چھلکے میں پایا جاتا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر لوگ اصرار کرتے ہیں کہ روٹی پکاتے وقت گیہوں کے آٹے سے بھوسی الگ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن میں تو اب خوب چھان پھٹک کر گیہوں تیار کراتا ہوں اور پوری احتیاط کرتا ہوں کہ کہیں گیہوں کے ساتھ گھن نہ پس جائے ـــــ میرا مطلب ہے وٹامن نہ پس جائے!

چنانچہ اب میں اپنے مہمانوں کی جو اکثر وٹامن کے عاشق ہوتے ہیں بڑی آؤ بھگت کرتا ہوں، سبزی ترکاری کے علاوہ اُنہیں پھل بھی کھلاتا ہوں۔ خود سیب کا گودا کھاتا ہوں، اُنہیں چھلکے کھانے کو دیتا ہوں، خود چاول کھاتا ہوں اُن کے لئے دھان کے خول اُبال کر رکھتا ہوں، خود میدے کے نرم نرم پراٹھے کھاتا ہوں، ان کے لئے بُھوسی کی روٹی میز پر رکھتا ہوں۔

آپ کو بھی وٹامن سے محبّت ہوگی! کبھی غریب خانے پر تشریف لائیے، انشاءاللہ ایسے ایسے وٹامن کھلاؤں گا کہ طبیعت ہمیشہ کے لئے سیر ہو جائے گی۔ پتہ ہے۔ ۷۔۲۱ تلک روڈ۔ پونا نمبر ۲۔

گھونگھٹ میں گوری جلے

گھونگھٹ میں گوری جلے.....

ہریانے کا جاٹ دلی کی سڑکوں پر یہ گیت گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ لااُبالی، تنومند آنکھوں میں شباب کی تشنگی اور خمار لیے ہوئے: "گھونگھٹ میں گوری جلے" میں یہ مصرعہ سُن کر ٹھٹک گیا۔ سوئے ہوئے دماغ کے اندھیارے میں یہ مصرعہ بجلی کے کوندے کی طرح لرز گیا، اور میں نے دیکھا گوری کا کنوارا حُسن گھونگھٹ کی ریشمی سلوٹوں میں شمع کی طرح روشن ہو اُٹھا ہے، اس مصرعہ میں چمک رہا ہے، جو ہریانے کے نوجوان جاٹ کی زبان پر ہے۔ ان آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا ہے جن میں شباب کی تشنگی اور خمار ہے: "گھونگھٹ میں گوری جلے"۔ لیکن اب پروانہ سڑک پر بہت دُور نکل گیا تھا۔ اُس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔ نشہ ہلکا۔ یکایک قریب سے ایک آواز آئی۔ چند پنجابی مزدور جو خیمے بنانے والے ٹھیکہ دار کے کارخانہ سے کام کر کے واپس آ رہے تھے۔ سڑک پر گاتے ہوئے جا رہے تھے۔

"کالی تیتری کالی تیتری، کمادوں نکلی تے اُڈی نوں باج پے گیا۔ لائے نے اُڈی

نوں باج پے گیا؟

کماد کے کھیت سے نکلی ہوئی کالا لہنگا پہنے ہوئے۔ کالا لہنگا اور گوری گوری باہیں سیاہی اور سپیدی کا امتزاج اور پھر تیتر اور باز کی لڑائی، ایک تیز اڑان، پالنے کی وحشی آرزو، ایک ننگا بے اختیار سا جذبہ...... لیکن یہ باز بھی تیتریوں کی گھات میں سڑک پر تیز تیز قدموں سے اڑتے چلے گئے اور جب میں نے راجپور روڈ کا موڑ طے کیا تو دھوبیوں کے قبیلے کا ایک لڑکا پیٹھ پر میلے کپڑوں کی گٹھری اٹھائے مجھ سے ٹکرا گیا۔ گیت گاتا ہوا بے سدھ چلا آرہا تھا: "پریت کرو تم، پریت اے سجنی، پریت" اور اسکے بعد یہ ٹکر۔ یعنی عشق اور ایک کلرک کی ٹکر۔ کلرک نے شکست کھائی۔ اور سڑک کی دوسری طرف ہو گیا۔ دھوبی کا لڑکا گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پریت کرو تم، پریت اے سجنی...... میں نے سوچا معلوم نہیں اس سڑک پر عشق کی اس قدر فراوانی کیوں ہے۔ ننگی آوارہ سی سڑک ہے، یہ معلوم نہیں کدھر جاتی ہے کہاں ٹھہرتی ہے۔ دونوں طرف نیم کے روکھے سوکھے درخت کھڑے ہیں۔ جن کے پتے بھی کڑوے اور نمولیاں بھی۔ عورت تو کیا کبھی بھولے سے لڑکیوں کے کالج کی خالی لاری بھی ادھر سے نہیں گزرتی کہ سہارے سے ہی عشق ہی کیا جا سکے پھر بھی جو ہے عشق کا راگ الاپے جا رہا ہے۔ سڑک کے ایک طرف قبرستان ہے، لیکن اسے دیکھ کر بھی کسی کے جذبۂ معرفت کو انگیخت نہیں ہوتی۔ اس قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبریں ہیں۔ قبروں کی جگہ گڑھے ہیں۔ بیر کی جھاڑیاں ہیں، بھورے پھولوں والے پودے ہیں، جو اپنے بھورے پھولوں، اور سیاہ کانٹوں کا جھاڑ چاروں طرف پھیلائے ہوئے ہیں، چیونٹیوں کے ٹیلے ہیں، رینگتے ہوئے سانپ ہیں۔ بدصورت چھپکلیاں چوہے اور چھچھوندر ہیں۔ غرض مرنے کے بعد انسان کے اجزائے ترکیبی جس طرح پریشان ہوتے ہیں اس کی مکمل تصویر یہاں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود سڑک کے غافل اس گھڑیال کی منادی نہیں سنتے۔ اور اپنی دھن میں گاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

پریت کرو تم پریت اے سجنی ...... پنجابی جاٹ نے اپنی عورت کے کالے لہنگے کی طرف دیکھا اور ہریانے کے دیہاتی نے گوری کے گھونگھٹ کی طرف اور دونوں کو فوراً عشق ہوگیا۔ یہ کیا بات ہے؟۔

معلوم ہوتا ہے ہندوستان کو عشق کی بیماری ہے۔ اس ہٹرک کی رگیں ہندستان کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی لئے تو پچھلی دو مردم شماری میں آبادی دس کروڑ بڑھ گئی ہے۔ گو رقبہ وہی ہے، حکومت وہی ہے، حدود اربعہ وہی ہے، زمین وہی ہے آسمان وہی ہے۔ لیکن آبادی دس کروڑ بڑھ گئی ہے۔ اور ابھی تک ریڈیو برابر ہر گھر میں ہر لمحہ یہ صدا لگاتا ہے۔ پریت کرو تم پریت اے سجنی۔ دھوبی کے لڑکے سے لیکر ریڈیو تک ہندستان کی ہر چیز مرئی یا غیر مرئی، جاندار ہو یا غیر جاندار، انسان یا حیوان عشق کے بے پناہ جذبے سے ہمکنار ہے۔ جوں جوں اس کی وارفتگی بڑھتی جاتی ہے ہندستان کی آبادی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور آخر وہ دن بھی آئے گا جب اس جنت نشان میں عشق کے سوا اور کچھ دستیاب نہ ہوسکے گا، نہ روٹی نہ پانی، نہ کپڑا، نہ گھر، بس چاروں طرف عشق ہی عشق ہوگا۔ بس جیئے جاؤ اور عشق کیے جاؤ۔

بظاہر ہمارے دیس کو عشق میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں اور اکثر حالتوں میں چوری کرنے اور قتل کرنے کی طرح معیوب سمجھا جاتا ہے اور سزا کا مستوجب۔ لیکن یہ ظاہری باتیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں عشق کے بغیر گزارہ نہیں۔ گھروں میں، گلیوں میں، بازاروں میں، کلبوں میں ہر جگہ عشق کے چرچے ہیں، مشاعروں میں دس سال کی عمر کے لڑکوں سے لے کر ستر اسّی سال کے بوڑھے شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر شعر کا ہر لفظ عشق کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ جوانوں میں تو خیر عشق ایک خودرو جذبہ ہے۔ ایک والہانہ بلکہ ابلہانہ قسم کا عشق "اے عشق کہیں لے چل" چاندنی چوک لے چل یا چاوڑی لے چل۔ گندے نالے لے چل، یا گوالمنڈی

لے چل، کہیں، خدا کے لئے کہیں لے چل، قسم کا عشق جو اکثر عاشق کو محبوب کا مُنہ دکھانے کی بجائے جیل خانہ کا منہ دکھاتا ہے. لیکن خیر یہ تو نوجوانی کی شاعری ہے. شباب کا خمار، لیکن اس دیس کے بوڑھے بھی اتنے ہی رنگیلے ہیں. وہی سوز و گداز وہی آہ و زاری، وہی ہجر و فرقت، آنکھوں میں دم نہیں، دانت غائب ہیں. جسم پر رعشہ طاری ہے. زبان پر لکنت ہے، نہ آگ ہے نہ تپش، لیکن اپنی شاعری میں عشق کا پیوند ضرور لگائے جا رہے ہیں. کیونکہ عشق ہر حال میں عشق ہے، چاہے خود رَد ہو چاہے پیوندی، اس عشق کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا. سفید بالوں میں خضاب، ڈاڑھی میں مہندی، ہاتھ میں داغ کا دیوان، عشق کے سارے لوازمات مہیا کئے جاتے ہیں.

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اسکی آزادی کا ہے، اُس کی غربت کا ہے، اُس کے مزدوروں اور کسانوں کا، اسکے ہندوؤں کا، مسلمانوں کا، وہ لوگ جھک مارتے ہیں. نہ ہم ہندوستان چاہتے ہیں نہ پاکستان، ہم صرف عشق چاہتے ہیں. ہر صبح عشق، ہر شام عشق. اس زندگی کا نام ہے عشق. گھروں، کلبوں، بازاروں اور سڑکوں کا تو ذکر کر چکا. صبح اُٹھتے ہی جب مَیں اپنا اخبار کھولتا ہوں، تو اس میں سب سے زیادہ اشتہار شادی کے متعلق ہوتے ہیں. ضرورت ہے لڑکے کی. ضرورت ہے لڑکی کی. پھر پریم شاستروں اور کھرک شاستروں، اور پھر چھُپ کر رات کی تنہائی میں دیکھنے والی عشق افروز تصویروں کے متعلق، عملِ حُب کے اشتہار، اور عشقیہ فلموں کے اشتہار. اسٹیشن پر جاؤ تو بھی وہی اشتہار. وہی پریم شاستر اور وہی محبوب دو منٹ میں حاضر. حد یہ ہے کہ اس گاؤں میں جہاں تھانہ نہیں، سکول نہیں، دیہات سدھار نہیں، وہاں بھی یہی عملِ تسخیر موجود ہے. وشی کرن منتر، پیر جی کی کرامات، محبوب خود بخود تمہارے قدموں میں دوڑا چلا آئے گا. کیا آپ کی عورت آپ سے ناراض ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے کسانوں کو نہ ٹریکٹروں کی ضرورت ہے نہ کھاد کی، نہ زمین کو زرخیز

بنانے کی۔ اور فصل بڑھانے کے، نئے نئے طریقوں کی۔ اگر ضرورت ہے تو صرف عشق کی۔

عشق کا پہلا اُصول یہ ہے کہ کسی بھی شئے سے عشق کیا جا سکتا ہے، بیویوں کو اپنے خاوند، میکے اور بچوں سے تو عشق ہوتا ہی ہے لیکن اُنہیں اپنے گھر کے آنگن میں لٹکی ہوئی بوسیدہ رسی اور غسلخانہ میں پڑے ہوئے لوٹے سے بھی انتہائی عشق ہوتا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی اُنہیں اپنے گھر سے باہر پھینک دینے کے لئے تیار نہیں ہوتیں، خاوندوں کو جتنا عشق اپنی بیویوں سے ہوتا ہے اتنا بلکہ اُس سے کہیں زیادہ عشق اُنہیں اپنے دفتر کی ٹوٹی ہوئی میز اور اپنے افسر کے گنجے سر سے ہوتا ہے۔ محبوب مجازی خدا ہوتا ہے اس لئے یہ لوگ اپنے مجازی خدا کا ہر حکم بجا لاتے ہیں۔ اس کے عشق میں کیا کچھ نہیں کرتے، کیا کچھ نہیں سہتے ملامتوں کے ہار، چپراسیوں کی گھرکیاں، انتظار، یہ لوگ نوکری کو نوکری نہیں سمجھتے بلکہ ایک فریضہ عشق جس میں محبوب کی ادائے التفات کے لئے جان تک دیدینا بھی روا ہے۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں اس عشق کی آگ پہلے پہل میکالے نے پھونکی۔ مدراسی اور بنگالی کلرکوں نے اُسے پروان چڑھایا اور اب سارا ہندوستان، اس نوکری کے عشق میں گرفتار ہے!

لیکن ہندوستان میں عشق کوئی چیز نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے زمانہ میں بھی ہندوستان میں عشق کرنیکے سوا اور کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا۔ کم از کم مجھے تاریخ بتانے والے اُستادوں نے یہی بتایا ہے۔ اور تاریخ لکھنے والوں نے بھی یہی لکھا۔ فلاں راجہ فلاں رانی پر عاشق ہوا اور ہزاروں لوگ جنگ میں مارے گئے۔ فلاں شہزادہ، فلاں شہزادی کے عشق میں گرفتار ہوا اور آدھے ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، فلاں راجہ کے محل میں اتنی رانیاں تھیں فلاں بادشاہ کے حرم میں اتنی بیگمات۔ مہابھارت سے لیکر محمد شاہ رنگیلے تک ہندوستان کی تواریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کس طرح عشق نے غریبوں کے خون سے ہولی کھیلی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ہمارے تاریخ داں ہمیشہ اس بات پر کیشٔ

کرتے ہیں کہ فلاں بادشاہ یا فلاں وزیر کا چال چلن اچھا تھا یا برا اسی موضوع پر کتابیں لکھی جاتیں مثنویاں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس بادشاہ کے عہد میں رعایا کا کیا حال تھا، لگان کا بوجھ کتنا تھا، سڑکیں کس حالت میں تھیں۔ عدل و انصاف کا کیا طریقہ تھا، ہاں اگر ایک عبادت گاہ کی اینٹ سہواً یا عمداً دوسری عبادت گاہ میں لگا دی گئی۔ تو بس تاریخ کے اوراق کالے کر دیئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو جتنی محبت شکستہ اینٹوں سے ہے اتنی زندہ انسانوں سے نہیں۔ ہم درختوں سے عشق کرتے ہیں۔ ہر گاؤں میں ایک نہ ایک درخت ضرور ایسا ہوتا ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے اور اس درخت کی شاخوں اور تنوں پر اتنا کپڑا منڈھا ہوتا ہے کہ گاؤں کے سارے افراد کے تن ڈھانپنے کے لئے کافی ہو لیکن گاؤں والوں کا ایثار دیکھئے کہ خود تو اکثر ننگے رہتے ہیں اور اپنے محبوب کو کپڑے پہنواتے ہیں۔ مبادا اس درخت کو سردی لگ جائے۔ جذبۂ عشق کی یہ انتہائی مثال ہے جو آپ کو دوسرے ملکوں میں مشکل سے ملے گی۔

ایک دفعہ میں ایک عجیب بازار میں سے گذرا۔ بلند و بالا کوٹھوں پر بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ لال، پیلے، نیلے، نارنجی، ان رنگا رنگ قمقموں کی روشنی میں عورتیں خوبصورت لباس پہنے، سرخ غازہ لگائے خاموش بیٹھی ہیں ہم سے عشق کر لو، دو دو روپے، ہم سے عشق کر لو، دو روپے۔ اس قسم کا عشق پیدا ہوتا ہے بلکہ جسم پر بھی جلن ہوتی ہے۔ ظاہری اور روحانی اور جسمانی۔ مجازی اور حقیقی، ہر لحاظ سے یہ عشق مکمل، صحیح اور جامع ہے۔ بعض جگہوں پر میں نے جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا: "مس بخت آور جہاں، ریڈیو آرٹسٹ"۔ یعنی ایک تو کڑوا زہریلا دوسرے نیم چڑھا "مس لچھمی بائی آگرے والی"۔ آگرہ کیوں؟ شاید اس لئے کہ آگرے کو عشق سے ایک خاص تعلق ہے۔ آگرہ میں روضۂ تاج محل ہی عشق و محبت کی لافانی یادگار، میں نے بھی ایک چاندنی رات میں اس خواب مرمریں کو دیکھا تھا۔ اس کی چاندنی کی خوبصورتی سپید اداسی کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی، اور پھر یکایک میرے دل پر کوئی ہتھوڑا

مار مار کر کہنے لگا، بھاگ جاؤ، اس مرمریں طلسم سے دُور بھاگ جاؤ، اس حسین موت کو اپنی آرزوؤں کی تکمیل کا مرقد نہ بناؤ۔ ایک ایسے شاہجہاں کو ڈھونڈو جو اس سپید اداسی کے بجائے قہر و غضب کا شعلہ تعمیر کرے، محبت کی یادگار کے بجائے نفرت کا ایک ایسا روضہ بنائے کہ اُس کی دیواروں کے ساتھ لگ کر بہنے والی جمنا کے آنسو بھی انتقام کے شرارے بن جائیں۔

لیکن اس سرزمین میں شاید یہ ممکن نہیں۔ اُس سرزمین میں جہاں لوگ اپنی چہیتی بیویوں سے اسی طرح عشق کرتے ہیں جس طرح اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں سے۔ اس ملک میں اگر روضہ تاج محل موجود ہے، تو وہ مقبرہ بھی ہے جہاں محمد تغلق نے اپنے ٹوٹے ہوئے چہیتے دانت کو دفن کیا تھا۔ گو محبوب مختلف ہیں، لیکن محبت کی نوعیت وہی ہے۔ جذبہ وہی ہے، شدّت وہی ہے، ہندوستان کے لوگوں کو نہ صرف درختوں سے عشق ہوتا ہے بلکہ دانتوں سے، پتھروں سے، سانپوں سے، بندروں سے، ننگ دھڑنگ سادھوؤں سے، فلم ایکٹریسوں سے بھی اسی شدّت کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے پچھلے چند سالوں میں فلم ایکٹریسوں سے عشق کرنے میں ہندوستان والوں نے جس قدر وقت اور روپیہ صرف کیا اُس سے سارے راجپوتانہ کو سیراب کرنے کے لئے ایک نہر کھودی جا سکتی تھی، ہوائی جہازوں کے چار نئے اسکواڈرن تیار ہو سکتے تھے، تپ دق کی روک تھام کے لئے بیس بڑے ہسپتال کھولے جا سکتے تھے۔ لیکن عشق ہمیں ان باتوں کی مہلت ہی کب دیتا ہے۔ یہ عشق ہمیں آداب خود آگاہی نہیں سکھاتا، بلکہ غلامی، فسردگی اور موت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس عشق کا علاج ہونا چاہیئے۔ چاہے اسکا علاج جیل خانے سے کیا جائے۔ یا بجلی، یا بھاپ سے، مجھے اس سے غرض نہیں، لیکن علاج ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ حقیقی ہو یا مجازی، نیا ہو یا پرانا، بادی ہو یا صفراوی، اس کا علاج ہونا چاہیئے ورنہ اس بیمار کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔

❁ ❁ ❁

گھونگھٹ میں گوری جلے ......!

لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ گوری گھونگھٹ کو جلا دے، یہ شمع فروزاں فانوس کی چاردیواری سے باہر نکل آئے، اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دے، محبت کی آگ میں نفرت کی آگ۔

گومتی کنارے

جس روز لکھنؤ پہونچا اُسی دن احباب نے لا مارٹی نیا میں ایک پک نک کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ اکّوں میں سوار ہو کر رات کے نو بجے لا مارٹی نیا پہونچے۔ لکھنؤ کا اِکّہ لکھنؤ کی ایک خاص چیز ہے نہ صرف دیکھنے کی بلکہ بیٹھنے کی۔ دُور سے اکّے کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی گھوڑے کو پھندا لگا یا ہے اور قریب جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا صید نہیں خود صیّاد ہے اور اکّے میں بیٹھنے والے کو پھانسی کی سزا دے رہا ہے۔ یہ اکّے کے کرشمے ہیں کہ جب آپ اس میں بیٹھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ اِکّے پر سوار نہیں ہیں اکّہ آپ پر سوار ہے۔ اکّہ جھولتا ہے، جھومتا ہے، زندگی اور موت کے درمیان نئے زاویئے بناتا ہوا آپ کی ہڈی ہڈی جھنجوڑتا ہے۔ اور شکستہ سڑک کے پتھروں سے ٹکراتا ہوا خوشی سے گنگناتا ہوا مست شرابی کی چال سے لا مارٹی نیا کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ دُور بہت دُور کسی ہندوستانی فلم کی طرح جس کے انجام کا کچھ پتہ نہ ہو۔ لیکن سوچیئے کہ یہ اکّے کی سواری کیوں ؟ اس میں بیٹھنے سے تو بہتر یہی ہے کہ آدمی کسی پنجرہ پول میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو کسی بوڑھے سلوتری کے

حوالے کر دے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، لیکن صاحب اکّے کے ایک ہزار فائدے ہیں، پہلے تو یہی فائدہ ہے کہ ہمارے سارے جسم کی مالش کرتا ہے۔ اور لکھنؤ والے ورزش کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن ورزش بقائے حیات کے لئے ایک بہت اچھا فعل ہے۔ اس لئے اگر لکھنؤ میں وہی فرض بجالاتا ہے جو لاہور میں ڈنگل یا اکھاڑہ اور بمبئی میں جمنیزیم اور دیہات میں سرسوں کا تیل اور امیر گھروں میں روغن بادام اور پھر ان تمام چیزوں کا ایک بدل ہے اور وہ ہے اکّہ، اور اس پر لطف یہ ہے کہ سستا بھی ہے اور امیر غریب جوان بوڑھا بچہ ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لیکن اکّہ صرف جسم کو ہی نہیں بلکہ روح کو بھی فیضان پہونچاتا ہے جب تک آپ اکّے میں بیٹھے رہیں موت آپ کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے، زندگی اور موت میں جو ایک باریک سا پردہ حائل ہے اکثر اٹھا ہوا نظر آتا ہے اور اکّے میں بیٹھا ہوا انسان اکثر حیات و ممات کی حدیں پار کر کے فن اور شعور اور ادراک سے پرے اس جہانِ رنگ و بو کا تماشا کرتا ہے جسے لوگ جنّت یا جہنم یا اعراف کے نام سے پکارتے ہیں اور گو یہ تینوں نام مختلف ہیں، ان کا مظہر صرف ایک ہی ایک اکّہ!

میں بھی اکّہ میں بیٹھا ہوا کشمکش حیات کو اسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میرے ساتھی کی کہنی ایک وحشیانہ انداز میں میری پسلیوں میں جا لگی۔ میرا ساتھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مسکرانے لگی، کیونکہ وہ ایک عورت تھی، ایک بدصورت، فربہ اندام، سفید رنگ کی عورت جسے اپنے حسن پر بیحد ناز تھا۔ (محترمی صلاح الدین احمد صاحب کو گلہ ہے کہ میں ہمیشہ بدصورت عورتوں کا ذکر کیوں کرتا ہوں، ان کا خیال ہے کہ مجھے بدصورت عورتوں سے عشق ہے، صاحب یہ بات نہیں، مجھے بدصورت عورتوں سے عشق نہیں ہے، بلکہ بدصورت عورتوں

کو مجھ سے عشق ہے) حادثات ہیں زمانہ کے۔ یا یوں کہیے کہ اپنی اپنی قسمت ہے، ورنہ اگلے اکّے میں جاوید کی بغل میں ایک نہایت خوشرو نازک اندام لڑکی بیٹھی تھی، اور ہمارے پیچھے پیچھے جو اکہ آرہا تھا، اس میں دو نو خیز، شریر دو شیزاؤں کے درمیان عشرت صاحب ہنسی کا گول گپّا بنے ہوئے چلے آرہے تھے۔ خوش، شاداں و فرحاں، اب سب مجھے معلوم ہوا کہ پک نک پر جانے کے لئے اکّے کیوں مہیا کئے جاتے ہیں۔ اکّے پر بدن چرانے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ بات خود بخود کمر میں ڈال دئے جاتے ہیں۔ بال پریشان ہو جاتے ہیں۔ خوشبوئیں اُڑ اُڑ کر نتھنوں میں پہنچنے لگتی ہیں، مزے سے شانہ بشانہ بیٹھے ہیں اور اکثر ایک ایسا دھچکا لگتا ہے یا یونہی محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسا دھچکا لگا کہ گال سے گال چھو جاتے ہیں اور بوس و کنار کا سارا لطف حاصل ہو جاتا ہے اور وہ بظاہر گھبرا کر کہتی ہیں۔ اُوئی یہ اکہ کس قدر برا ہے! (یعنی اے کاش یہ اکہ اس سے بھی برا ہوتا!)

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اپنی اپنی قسمت ہے۔ اور صلاح الدین احمد صاحب کو مجھ سے شاکی ہونے کے بجائے میری قسمت سے شاکی ہونا چاہیئے۔ میں اکّے میں بیٹھا تھا، یا لیٹا تھا یا اکڑوں تھا یا چلتا تھا۔ اتنا ضرور پتہ ہے کہ میں اکّے میں تھا۔ اور وہ بد صورت، فربہ اندام، سفید رنگ کی عورت دیوارِ چین بنی اس میں بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے بالوں میں ایک نہایت تیز قسم کی جاہلانہ خوشبو لگا رکھی تھی۔ اور گاہے گاہے وہ مجھے التفات کی نگاہوں سے اس طرح دیکھتی تھی، جس طرح بلّی چوہے کی طرف دیکھتی ہے۔ میں کانپ کر ذرا پرے سرک گیا اور اُن کی موٹی کہنی میری پسلیوں میں جا لگی۔

میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا: آہا! کس قدر سہانا منظر ہے۔ یہ درختوں کی پرچھائیاں یہ چاندنی رات کا دھندلا دھندلا غبار، یہ سنگیسر کے پھول، شعلوں کی طرح دمکتے ہوئے!

دیوارِ چین نے ایک آہ بھری، ایک تیز جھنکار، اور دوسرے لمحے میں گوشت و

بوست کا یہ طوفانِ عظیم میری منحنی آغوش کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دیا۔ میں ذرا اور پیچھے سرکا۔ لیکن قد ابریسے اکہ نہ تھا۔ خلا تھی، کائنات تھی۔ زمین کی کششِ ثقل تھی۔ سارا نظامِ فلکی گردش کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں سڑک پر گر پڑا اور وہ جنگھاڑیں۔ ابے لینا۔ لینا۔ اوہ ٹھیراؤ اکہ......

جاوید مسکرا رہا تھا۔ کمینہ!

لکھنؤ میں گومتی بھی ہے، جہاں سری راجچندر جی نے خودکشی کی تھی۔ لیکن اس کے ٹھہرے ہوئے پانی اور میلی متعفن فضا کو دیکھ کر کس کا جی خودکشی کرنے کو نہیں چاہتا۔ سارے شہر کے گندے نالے گومتی میں آکر مل جاتے ہیں۔ اور گمان ہوتا ہے کہ گومتی کا اپنا کوئی وجود نہیں بلکہ وہ انہی غلیظ اور گندے نالوں سے مل کر بنی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گومتی کو پیار سے "گھریلو ندی" کہا جاتا ہے۔ اس ندی میں شام کے وقت لوگ تفریح کے لئے کشتی چلاتے ہیں۔ اس کے کنارے کنارے سیر کرتے ہیں۔ اور شعر گنگناتے پھرتے ہیں۔ گومتی کے اس پار لکھنؤ کا شہر ہے اور اُس پار لکھنؤ یونیورسٹی۔ نام لکھنؤ یونیورسٹی ہے لیکن پروفیسر سب بنگالی ہیں۔ اور طلبا، سب پنجابی یا بہاری یا سندھی۔ قیاس غالب ہے کہ لکھنؤ کے طلبا، لکھنؤ میں پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ یہی حال دیگر تعلیمی اداروں کا ہے۔ میرس کالج آف میوزک میں مرہٹے ہیں۔ گجراتی ہیں، سیلونی ہیں۔ اندھرا دیش باسی ہیں، بنگالی ہیں۔ لکھنؤ والے ناپید ہیں۔ لڑکیوں کا کالج ہے۔ لیکن تقریباً سب لڑکیاں باہر سے آتی ہیں۔ اگر کوئی لڑکی اپنے آپ کو لکھنؤ کا بتاتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ شاعری کر رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن کسی کے ساتھ بھاگ جائیگی۔

ایک اور عجیب بات جو میں نے لکھنؤ میں دیکھی، وہ یہ کہ لکھنؤ میں شاعر نہیں۔ کوئی شاعر نہیں۔ میں ایک دفعہ پورے تین دن اکّے میں بیٹھ کر ہاٹ میں گھڑیال لیکر لکھنؤ

کے بازاروں اور گلی کوچوں کا چکّر لگاتا رہا۔ کوئی ہے شاعر! کوئی شاعر ہے؟ لیکن مجھے کوئی شاعر نہ ملا۔ نہ شاعر نہ نواب، نہ بٹیر باز، نہ پتنگ باز۔ یہ لوگ جو لکھنؤ کو بیکاروں کا مسکن بتاتے ہیں، لکھنؤ کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور اس افترا کی بنیاد پہلے پہل خود لکھنؤ والوں نے اپنے ہاتھوں سے رکھی۔ یعنی خدا بخشے عشرت لکھنوی اور رتن ناتھ سرشار نے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بیکاروں کی تعداد لکھنؤ میں ہندوستان کے اور شہروں سے زیادہ نہیں، میں نے تو یہاں مزدور دیکھے، دُکاندار دیکھے، فوجی دیکھے، کلرک دیکھے، خوانچہ فروش دیکھے، ہوٹل والے دیکھے، اکّے والے دیکھے، لیکن بٹیر باز اور پتنگ باز کہیں نہ ملے۔ چانڈو خانہ کہیں نہ ملا۔ افیم گھولنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ناچار کافی ہاؤس میں جا بیٹھا۔ اور اُن سفید فام زلف بُریدہ کشمیری نژاد لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جو کبھی کشمیر کے جنگلوں میں وحشی ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں اور آج جارجٹ کی ساڑھی میں مقیّد ایک سبز میز کے کنارے کافی کا پیالہ ہاتھ میں لئے پالتو مینا بنی بیٹھی تھیں۔ ہائے اس انسان کی خود فریبی۔ جب یہ چند تنکے یا تیلیاں چُن کر اپنے اِرد گِرد ایک گھونسلا یا پنجرا کھڑا کر لیتا ہے تو پھر اس قیدخانوں کی سلاخوں سے باہر جھانکتا ہے۔ اور پنجرے سے باہر رہنے والوں کو وحشی، بربری، غیر مہذّب اور نہ جانے کیا کچھ بتاتا ہے، ابھی تک یہ پنجرے، یہ پالتو مینائیں اس انسانی تہذیب کی اثاثِ کلی ہیں۔ اور جب میں کہتا ہوں کہ اس کافی ہاؤس کی گھٹی فضا سے جنگل کی مہکی ہوئی فضا بہتر ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ کافی پینے سے کسی میٹھے چشمے کا پانی پینا بہتر ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ جارجٹ پہننے سے بھیڑیں چرانا یا آنگی بننا زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ صحت بخش ہے تو لوگ ہنس دیتے ہیں۔ رومانیت پسند...... پتہ نہیں ان مہذّب قفس پسند لوگوں کی خود فریبی کب ختم ہوگی!۔

کہتے ہیں، لکھنؤ باغوں کا شہر ہے اور یوں دیکھا جائے تو لکھنؤ میں باغ بہت ہیں،

ایک تو قیصر باغ ہے۔ چند ایک گندے محلّوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں دو ایک گولر کے روکھے سوکھے درخت بھی ہیں۔ جن کے نیچے ننگ دھڑنگ بچے لٹّو گھماتے رہتے ہیں۔ نذر باغ میں باغ تو کیا ایک جھاڑی بھی نہیں۔ البتہ پان کے پتّے کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور جہاں پان کے پتّے ہوں، وہاں تاش کے پتّے ضرور دکھائی دیں گے۔ پھر چار باغ ہے۔ یہاں لکھنؤ کے چار باغ ملتے ہیں۔ لیکن یہ صرف تخیّل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں چار باغ نہیں ہیں بلکہ چار ریلوے لائنیں ملتی ہیں۔ اس لئے یہاں پر ایک ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا ہے۔ جو لکھنؤ ریلوے اسٹیشن کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسکے سامنے تانگے والوں کا شیڈ ہے۔ جہاں حقّے کی بو اور گھوڑوں کی لید مشامِ جان کو تازہ کرتی ہے۔ پھر سکندر باغ ہے۔ جہاں باغ کم اور قبریں زیادہ ہیں۔ جنہیں دیکھکر "سکندر کے ہات دونوں خالی کفن سے نکلے" والی نظم یاد آتی ہے۔ لے دے کر ایک بنارسی باغ رہ گیا تھا لیکن اس میں بھی یار لوگوں نے چڑیا گھر بنا دیا ہے۔ اور ہاتھی۔ لومڑ، چیتے، اونٹ، الّم غلّم سب لا کے جمع کر دیا ہے! .... سمجھ میں نہیں آتا ان لوگوں کی عقل کو کیا ہوا ہے!

لکھنؤ کی عمارتیں! آہا! آہا! لکھنؤ کی عمارتیں ہندوستانی فنِ تعمیر کے دورِ انحطاط کے بہترین نمونے ہیں۔ در اصل اس ضمن میں صرف لکھنؤ کو مطعون کرنا سخت غلطی ہوگی؛ پورے ہندوستان کا یہی حال ہے، جس قدر گھٹیا اور پست درجے پر ہمارا فنِ تعمیر پہنچ چکا ہے، ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے کسی اور شعبے میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ ہم قبریں اور سمادھیں محلوں کی طرح عالیشان اور پُر شکوہ بناتے ہیں۔ اور محل قبروں کی طرح بدصورت اور یاس انگیز۔ یہی حال ہماری عبادت گاہوں کا ہے۔ مسجد، مندر، گوردوالے، اور دھرم سالائیں، ہماری بیشتر عبادت گاہیں نہ تو گاتھک گرجاؤں کی طرح آسمان کی طرف اٹھتی ہیں، نہ چینی عبادت گاہوں کی طرح زمین کی طرف جھکتی

ہیں۔ اُن میں ایک عجیب سی کمینگی، رذالت اور تنگ نظری پائی جاتی ہے۔ تاریک درو دیوار، گٹ بے فرش، نمناک فضا، ان عمارتوں میں نہ جامع مسجد کی وسعت اور وجاہت ہے، نہ ایلورا کے مندروں کی سی خوبصورتی، نہ اجنٹا کے پر اسرار ماحول۔ ہماری قومی ذلّت اور انحطاط نے اُن عبادت گاہوں میں بھی گھر کر لیا ہے۔ حال ہی میں نئی دلّی میں برلا مندر بنا ہے۔ اُس پر لاکھوں روپئے صرف ہوئے ہیں۔ یوں تو یہ مندر ہے۔ لیکن دُور سے دیکھئے تو بالکل کسی بینک کی عمارت کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ہمارے بدلتے ہوئے تمدّنی نظام کا تاثر ہے کہ آج کل کی عبادت گاہیں بنک نظر آتی ہیں اور بینک عبادت گاہیں۔ آپ کسی بینک میں چلے جائیے، بالکل کسی پُرانی عالی شان عبادت گاہ کا سا منظر پائیں گے۔ خاموشی، پُر اسرار سناٹا۔ کلرک سر بسجود ہیں۔ رجسٹروں پر جھکے ہیں اور خدا کو یاد کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی بلّوریں، قندیلیں، جھاڑ اور فانوس چھتوں سے لٹک رہے ہیں۔ جن کے نیچے لوگ ایک گہری عبودیت سے آشنا ہو کر نہایت خضوع وخشوع سے نوٹ گن رہے ہیں۔ کبھی کبھی منیجر کی آواز کسی متبرک پاکیزہ اشلوک کی طرح فضا میں گونج جاتی ہے۔ اور سارے ماحول کو اور بھی پُر اسرار بنا دیتی ہے۔ یہاں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی۔ سکھ بھی اور عیسائی بھی۔ اور جس گہرے انہماک اور توجّہ اور حلم کا اظہار وہ یہاں کرتے ہیں اُن کی زندگی کے کسی اور شعبے میں نظر نہیں آتا......

لکھنؤ میں جہاں میں ٹھہرا تھا، اُسکے قریب ہی کسی راجہ نے اپنا محل بنوایا تھا۔ یہ چار منزلہ عمارت تھی۔ چھوٹی چھوٹی بالکونیاں۔ تنگ چوکور کھڑکیاں۔ دروازے پر مٹی کے ہاتھی اور لنگور، اور ہر منزل پر مٹی کے نمائی گلدان چھتوں کے کنارے دھرے ہوئے تھے، جن میں بے برگ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سب سے نچلی منزل میں دو پتھر کے ستون تھے جن کے ساتھ ساتھ دو سپاہی بنائے گئے تھے۔ یہ پتھر کے سپاہی گویا اسی محل کی حفاظت کر رہے تھے۔ کیوں کہ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں پتھر کی تلواریں

تھیں. ساری عمارت سے ایک عجیب قسم کی نحوست کا اظہار ہوتا تھا. نحوست اور رذالت اور بنیاپن، جیسے یہ کوئی عمارت نہ تھی. بلکہ کوئی ساہوکار تھا. جو آلتی پالتی مارے اپنا بہی کھاتا کھولے بیٹھا تھا اور سُود در سُود لگا رہا تھا. میرا اعتقاد ہے کہ ہر عمارت اُس کے بنانے والے اور اس کے مالک کی رُوحوں کا آئینہ ہوتی ہے. اور مجھے تو ہندوستان کی بیشتر عمارتوں کو دیکھکر ہی ہندستانی رُوح کی بلندی اور فضیلت کا اندازہ ہو جاتا ہے!

اور گو اب لکھنؤ میں شاعری نہیں ہوتی، لیکن بانکپن اب بھی ہوتا ہے. لکھنؤ کا بانکپن مشہور ہے. بانکپن، بلکہ یوں کہئیے کہ ترچھاپن. اور اگر زیادہ جمالی تعریف منظور ہو تو یوں کہیئے کہ سبطِ حسن، میرا دوست سبطِ حسن اس لکھنوی بانکپن کی بہترین مثال ہے، آڑا، ترچھا، مولے کی چال سے چلتا ہوا. اُس کے بالوں کی تراش تک ترچھی ہے. لکھنؤ کی ککڑیاں دیکھئے. ایسی باریک باریک منحنی، لطیف کہ معشوق کی انگلیوں کا دھوکا ہوتا ہے. لکھنؤ کے خربوزے. ایسے ہلکے پھلکے، پیارے پیارے ردئی کے گالوں کی طرح، لکھنؤ کے آم گٹھلی تک ناپید. لکھنؤ کی اے، آر، پی کی گھنٹی کی آواز ایسی شیریں، باریک، لوچدار کہ اس پر ارغواں کا دھوکا ہوتا ہے. سبطِ حسن سے لیکر لکھنؤ کی ککڑی تک لکھنؤ کی ہر چیز بانکی ہے. اور لکھنؤ کے معشوق کے بانکپن کا تو یہ عالم ہے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں معشوق کے کمر نہیں ہوتی. گلے میں آواز نہیں ہوتی. دماغ میں عقل نہیں ہوتی. ایسا بانکا، نرالا، البیلا معشوق آپ کو لکھنؤ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا —— (اور خدا کا شکر ہے کہ اب تو لکھنؤ میں بھی نایاب ہے!)

کسی نے مجھ سے کہا. صاحب اگر آپ کو اصل لکھنؤ دیکھنا منظور ہے تو نخاس چلئیے، نخاس. نخاس لکھنؤ کی جان ہے. چنانچہ میں ایک دن لکھنؤ کی جان دیکھنے نکلا. نخاس میں میں نے دیکھا کہ وہاں اب تک پُرانی چیزیں نیلام ہوتی ہیں.

پرانی کتابیں، پرانے فانوس، پرانے پلنگ۔ نخاس میں جو چیز ہے، پرانی اور تاریخی ہے۔ یہ ساغر، اس میں واجد علی شاہ شراب پیا کرتے تھے۔ یہ گھڑیال، مہاراجہ چندولال کے مندر کا گھنٹہ ہے، وہ شب و روز اُسے اپنے ہاتھ سے بجایا کرتے تھے۔ یہ پلنگ فلاں نواب نے اپنی فلاں چہیتی رنڈی کے لئے بنایا تھا۔ یہ پنکھا فلاں مغل شہزادی یا رانی کا ہے۔ اگر یہ سب سچ بھی ہو تو یہ سب چیزیں لکھنؤ کے عجائب گھر میں رکھی جانا چاہیئے۔ اور اگر یہ جھوٹ ہے تو ہماری روحانی غلاظت کی اس سے بدترین مثال اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنی اسلاف پرستی کو ذاتی منفعت کا وسیلہ بنا رہے ہیں اور اپنی رانیوں اور شہزادیوں کے پلنگ ان امریکی سیاحوں کے ہاتوں بیچ رہے ہیں جو رات کو اُن پر سوتے ہوئے ایک ایسے ذہنی تلذذ سے آشنا ہوتے ہیں جو ہر ہندوستانی کے لئے بے حد شرمناک ہے۔

جو لوگ اناؤ سے سیر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کو ایک عظیم الشان شہر سمجھتے ہیں۔ جو لوگ کلکتے سے بمباری کے خوف سے بھاگ کر یہاں پہنچے ہیں، انہیں لکھنؤ ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے۔ جو انگریزی سیاح عورت یہاں جنگی مصلحتوں کی بنا پر رک گئی ہے اور اپنے وطن نہیں جا سکتی، وہ لکھنؤ کو ایک عجائب گھر سمجھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ نخاس ہے اور نخاس ہندوستان ہے۔ وہ نہ ایک شہر ہے نہ دیہات، نہ عجائب گھر، وہ ایک بہت بڑا نیلام گھر ہے جہاں ہماری روح، ہماری تہذیب اور تمدن اور وراثت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اُسے اجنبی کے ہاتھوں بیچا جا رہا ہے۔ یہاں نہ صرف ہمارا ماضی بکتا ہے بلکہ ہمارا حال اور مستقبل بھی ..... آئیے ذرا اسے گھوم لیں۔

براڈکاسٹنگ کی بے ہودگیاں

براڈکاسٹنگ کی بے ہودگیوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے کچھ تامل محسوس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں براڈکاسٹنگ کی بے ہودگیوں کا اعتراف ہی خود سب سے بڑی بیہودگی ہے۔ بہرحال اب تو یہ فتنہ جگایا جا چکا۔ اب اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ چاہے آپ اسے "منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی" سمجھئے یا کچھ اور۔ اب یہ داستانِ غم آپ سے کہنی پڑے گی۔

براڈکاسٹنگ میں دو چیزیں کام کرتی ہیں، مشین اور آدمی، اکثر اوقات ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی ایک عامی ہونے کی وجہ سے میرے ذہن میں ان دونوں اشیاء کا وجود الگ الگ ہے۔ براڈکاسٹنگ میں آئے دن جو بیہودگیاں ہوتی رہتی ہیں، انہیں دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں کو بہ آسانی دو قسموں میں الگ کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مشینی بے ہودگیاں۔ (۲) انسانی بے ہودگیاں۔ لیکن ایک اور درمیانی تیسری قسم کی بے ہودگی بھی ہے جو مشینوں اور انسانوں کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے، اور جسے ہم ریڈیو کی اصطلاح میں مشینی اور انسانی

بیہودگیوں کا ملا جلا پروگرام" کہہ سکتے ہیں۔

براڈکاسٹنگ کی مشینی بے ہودگیوں سے تو آپ واقف ہوں گے، ابھی آپ جناب ریاض کا لکھا ہوا ہولناک ڈرامہ "نیلی لکیر" سُن رہے تھے، اور عین اُس مقام پر پہنچے ہیں کہ جہاں ڈرامہ کی ہیروئن کشتی کے چپوؤں کی آواز اور لہروں کی ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ ایک پُرنور گیت سُنا رہی ہے کہ یکلخت ایک کرخت آواز کھڑاک کے ساتھ ریڈیو بند ہوجاتا ہے، اور پھر ایک عرصہ تک ریڈیو میں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ آپ چاہے اُسے سو بار مروڑ دیجیے، جھنجوڑ دیجیے لیکن آواز ندارد۔ آپ حیران ہوتے ہیں: "یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل۔" یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا کسی نے ہیروئن کا گلا گھونٹ دیا، کیا ہیرو نے کشتی کا چپو اٹھا کر ہیروئن کے سر پر دے مارا، یا کشتی ہی دریا میں اُلٹ گئی، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب آپ نااُمید ہوکر کسی دوسرے اسٹیشن کا پروگرام سننے کی تیاری کرتے ہیں، کہ معاً اناؤنسر کی آواز آتی ہے: "ہمیں افسوس ہے کہ کل پُرزوں کی خرابی کی وجہ سے آپ جناب ریاض کا ڈرامہ "نیلی لکیر" تین منٹ تک نہ سُن سکے۔" یہ کل پُرزوں کی خرابی آپ کئی بار ریڈیو پر سُن چکے ہیں، کسی دلکش گیت کے دوران میں، کسی دلچسپ تقریر کے درمیان، کبھی کرکٹ میچ کے تبصرے کے آخر میں کہ جب سننے والوں کا جوش کرکٹ میچ دیکھنے والوں کی طرح انتہا پر ہوتا ہے، یکلخت ریڈیو کی آواز بند ہوجاتی ہے اور آپ کا سارا مزا کرکرا ہوجاتا ہے۔ اور پھر ایک لمبے عرصے کے بعد اناؤنسر یعنی معلن کی صدا سُنائی دیتی ہے۔ "ہمیں افسوس ہے کہ کل پرزوں کی خرابی ......" یہی مشینی بے ہودگی ہے۔ بعض اوقات یہی مشینی بیہودگی ایک لطیف طنز بن جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک ڈرامے کے دوران میں کل پُرزوں کی خرابی اس قدر بڑھی کہ ڈرامہ کے شروع سے لیکر اختتام تک مسلسل خاموشی رہی، اور ڈرامے کا ایک لفظ بھی نشر نہ کیا جاسکا۔ اس ڈرامہ کا نام "خاموشی" تھا! چنانچہ بائیس منٹ تک خاموشی رہی اور ڈرامہ نگار اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

لیکن بسا اوقات اس قسم کی بے ہودگیاں محض مشینی نہیں ہوتیں، بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا مشینی اور انسانی بیہودگیوں کا ملا جلا پروگرام ہوتی ہیں، ایک بار کا ذکر ہی، کوئی نو بجے کا عمل ہوگا، لوگ باگ تازہ خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولے بیٹھے تھے، ٹائم سگنل ہوا، اس کے بعد معلن کی آواز سنائی دی، اب آپ آل انڈیا ریڈیو سے ہندستانی میں خبریں سنیئے، یہ خبریں دلی، کلکتہ، بمبئی، مدراس، لاہور، لکھنؤ، ترچناپلی، ڈھاکہ اور پشاور سے ایک ساتھ سنائی جا رہی ہیں۔ اسکے بعد ایک خفیف سے جھٹکے کی آواز سنائی دی، اور پھر اس کے بعد جو فضائی دھماکوں کی آوازیں ریڈیو سے نکلنا شروع ہوئیں تو یار لوگوں نے سمجھا کہ شاید سٹوڈیو میں سانڈ ٹکریں مار رہے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد سانڈوں کی لڑائی ختم ہوئی اور معلن نے اظہار افسوس کرنے کے بعد خبریں سنانا شروع کیں۔

دراصل ریڈیو میں سانڈ نہیں گھس آئے تھے، کیونکہ اسٹوڈیو کے پہریدار کسی ایسے جانور کو اندر نہیں گھسنے دیتے، جس کے پاس اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کا اجازت نامہ نہ ہو۔ ہوا یہ کہ نو بجے کے قریب معلن صاحب خبریں سنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب ٹائم سگنل ختم ہوا تو آپ نے تعارف شروع کیا۔ خبروں کے تعارف کے دوران میں آپ کو معلوم ہوا کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں روشنی کافی نہیں ہے، آپ نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کے ٹیبل لیمپ کو اپنے قریب لانا چاہا۔ بدقسمتی سے لیمپ اسٹینڈ میں، اس وقت بجلی کی رَو چل رہی تھی۔ انہوں نے جونہی لیمپ اسٹینڈ کو ہاتھ لگایا اور انہیں دھچکے محسوس ہونے لگے۔ آواز میں لکنت آگئی۔ دل و دماغ پر رعشہ طاری ہونے لگا۔ چند لمحوں کے بعد حالت یہ ہوگئی کہ وہ تو بجلی کے لیمپ کو چھوڑنا چاہتے تھے، لیکن بجلی کا لیمپ انہیں نہیں چھوڑتا تھا۔ اب کیا تھا گھگھی بندھ گئی، نہ خبریں پڑھی جاتی ہیں، نہ لیمپ چھوٹا جاتا ہے، نہ کرسی سے ہلا جاتا ہے، اتنے میں ایک اور صاحب وہاں بھاگے بھاگے آئے کہ

دیکھیں یاالٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل یہ ماجرا کیا ہے؟..... کنٹرول روم کے انجنیئر صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ اور آخر بجلی کا بٹن دبا کر ان کی جان خلاصی کرائی۔

اس لئے اگر آپ آئندہ کل پرزوں کی خرابی کا ذکر ریڈیو پر سنیں تو اُسے محض مشینی بیہودگی پر محمول نہ کیجئے۔ بلکہ اُن جاں گسل، صبر آزما لمحات کا بھی اندازہ کیجئے جو اس اعلان کو دہرانے میں اکثر پیش آیا کرتے ہیں۔

انسانی بے ہودگیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے ان انسانوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو کسی براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر کسی قسم کے انسانی کام کرتے ہیں، اُن کا ذکر میں پھر کبھی کروں گا۔ اس وقت میں صرف ان لوگوں سے آپ کو متعارف کرانا چاہتا ہوں جن سے آپ لوگوں کا اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ اگر آپ کبھی کسی براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر تشریف لے گئے ہوں، تو آپ نے اکثر اس مخلوق کو دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ دن میں دفتر سے اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو سے دفتر کے کمرے تک گھومتے رہتے ہیں، اور گنگناتے رہتے ہیں۔ میرے لئے جہاں میں چین ہے نہ قرار ہے۔ ان کے سر پر ہیٹ نہیں ہوتا، کاندھوں پر کوٹ نہیں ہوتا، گلے میں ٹائی نہیں ہوتی، البتہ ایک ہاتھ میں سُرخ رنگ کی پنسل ضرور ہوتی ہے، جسے وہ بھوک لگنے پر چبا چبا کر کھاتے رہتے ہیں، اور جب یہ پنسل ختم ہو جاتی ہے تو چائے کی پیالی اور سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑوں پر قناعت کرتے ہیں۔ یہ لوگ دس بجے سے پانچ بجے تک دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اسکے بعد اسٹوڈیو میں چلے جاتے ہیں۔ اور جب آپ گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب اپنا ریڈیو بند کرکے ایک جمائی لیکر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں، اس وقت ان غریبوں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ اسٹوڈیو سے اٹھ کر اپنے بستر پر دراز ہو سکیں، کیوں کہ اُن کا بستر اسوقت اسٹوڈیو سے قریباً ڈھائی تین میل دُوری پر ہوتا ہے۔ چنانچہ کئی ایک تو وہیں اسٹوڈیو سے باہر شبنمی گھاس پر بیکر بیخ بستہ بن جاتے ہیں، اور دوسرے جو ترے بستر پر

مری جال، کبھی، کی لذتِ موہوم سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، اور اس کوشش میں بنا لیتے ہیں، اپنے ذہن کو دلدل کسی ویرانے کی، وہاں سے طوعاً کرہاً چل پڑتے ہیں، اور رینگتے رینگتے صبح ہوتے گھر پہونچ جاتے ہیں۔ راستے میں وہ اپنے پروگراموں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ وہ کیا سوچتے ہیں؟ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر آجانے کے بعد وہ گھر، سیر، تماشا، بیوی، بچے، دوست، کتابیں، ہر چیز کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ گویا دنیوی لذتوں سے ایک طرح مکمل نروان حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے فقیر منش لوگوں سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اُسے بیہودگی نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ ایک صوفیانہ لغزش! یہ لوگ جب دفتر میں رہتے ہیں تو اپنے اپنے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، لیکن جب اسٹوڈیو میں جاتے ہیں تو سندر بائی، تارا بائی، دل شلو بائی وغیرہ کی رعایت سٹینڈ بائی کہلاتے ہیں۔

جس طرح ایک سٹینڈ بائی ([illegible] افسر) کی بے ہودگیاں بے شمار ہیں، اسی طرح اُن کے فرائض بھی بے شمار ہیں۔ پروگرام چلانا، پروگرام بند کرنا، مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، مہمانوں کو باہر نکالنا، آرٹسٹوں کو چیک پیش کرنا، چیک روک لینا، رسید پر دستخط کرانا، ایک آنہ وصول کرنا نہ کرنا، بیک وقت چار پروگراموں کو سننا۔ سارنگی اور طبلے کا فاصلہ ٹھیک کرنا، جلترنگ کے پیالوں میں پانی ڈالنا، آرٹسٹ کو باتھ روم کا راستہ بتانا، اسٹوڈیو کے باہر لگی ہوئی سُرخ، سبز اور نارنجی بتیوں پر نگاہ رکھنا۔ کونسی بتی کس وقت بجھ جاتی ہے۔ کس وقت روشن ہو جاتی ہے، اور پھر اس بجھنے اور روشن ہونیکے درمیانی وقفے کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرنا۔ اس قسم کے درجنوں کام اسٹینڈ بائی کے سپرد ہوتے ہیں، پھر اُس کے دل بہلانے کے لئے اسکے کمرے میں ایک ٹیلیفون بھی لگا دیا گیا ہے۔ یہ ٹیلیفون متواتر کام کرتا رہتا ہے۔ اس ٹیلیفون کا اسٹینڈ بائی کا وہی رشتہ ہے جو سندباد سے پیر تسمہ پا کا تھا۔ اس ٹیلیفون

کو عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی)

کیوں جی اب وقت کیا ہوگا؟

ساڑھے سات بجے ہیں،

لیکن میری گھڑی پر تو ابھی دو منٹ باقی ہیں۔

گھڑی درست کر لیجئے،

اوہ، خوب یاد دلایا، شکریہ۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

آل انڈیا ریڈیو۔

اے ..... اے کیا آپ ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔

جی ہاں،

تو سنیئے، میرا نام رشیدی بیگم ہے۔ میں کل عورتوں کے پروگرام میں ایک گیت گاؤں گی۔ میں اس وقت پیانو پر بیٹھی مشق کر رہی ہوں، لیکن اس گیت کا آخری بند مجھے اس وقت یاد نہیں، "پریت کی ریت انوکھی" آپ کو یاد ہوگا، ذرا بتا دیجئے۔

مجھے یاد نہیں۔

آپ کو یاد نہیں؟ پریت کی ریت انوکھی، اجی پنکج ملک نے گایا ہے!

مجھے یاد نہیں۔

آں، ہاں، پنکج ملک نے نہیں، پہاڑی سانیال نے "بوڑھی دیدی" میں۔

جی میں نے بوڑھی دیدی نہیں دیکھی۔

آپ نے بوڑھی دیدی نہیں دیکھی، کیا آپ کو فلمیں دیکھنے کا شوق نہیں۔

جی مطلق نہیں۔

آپ بوڑھی دیدی ضرور دیکھئے، بڑا اچھا فلم ہے، بڑی اچھی تصویر ہے، بڑا اچھا گایا ہے، بڑی اچھی ہیروئن ہے، بڑا اچھا......

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

ریڈیو اسٹیشن!

جی ہاں! مَیں ابھی عرض کر چکا ہوں،

دیکھئے، میں نواب خاں جنگی سے بولتا ہوں۔ یہ اسوقت کون گا رہا تھا۔

جی، ابتے خاں شدھ سارنگ کا خیال سنا رہے تھے۔

شدھ سارنگ کا خیال؟ اجی حضرت، آپ کن گھامڑ لوگوں کو پروگرام دیتے ہیں، شدھ سارنگ کا خیال تو اس طرح گایا جاتا ہے، گگری موری پھوڑ، توڑ، چھوڑ، ا۔آ۔آ۔آ۔ نی۔پا۔ما۔گا۔ دھا۔ گگری موری آ۔آ۔آ......

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

میں نے کہا۔ جی، یہ فرنٹیر میل لاہور کے بجے جاتی ہے؟

ریلوے کے دفتر سے پوچھئے، یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔

ہلو۔ ہلو۔ ہلو۔ ہلو۔

ایک آفت ہے یہ ٹیلی فون کی گھنٹی۔ کسی کو گانے کا بند یاد نہ رہا ہو، کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو، کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو، وہ سیدھا ریڈیو اسٹیشن کو ٹیلیفون کرتا ہے، بسا اوقات یہ آوازیں سن کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن ہے یا مچھلی منڈی!

ٹیلی فون کی گھنٹی سٹینڈ بائی کی مصروفیت ثابت کرنے کے علاوہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں میں ان لوگوں کا بھی بہت بڑا

حصّہ ہے جو ریڈیو سنتے ہیں، ریڈیو میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام سننے کے لئے بھی آجاتے ہیں۔ پھر ایک تعداد ان لوگوں کی بھی ہے، جو گاہے گاہے ریڈیو والوں کو خط لکھا کرتے ہیں، یہ خط بالعموم بہت دلچسپ اور براڈ کاسٹنگ کے ہاضمے کے لئے بیحد مفید ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(الف) "جناب والا، منیجر ریڈیو صاحب ہذا، پرسوں میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہے، آپ دلشاد بیگم کو گانے کے لئے بھیج دیجئے، نیز ایک سہرا بھی بھیج رہا ہوں ازراہِ عنایت اسے ریڈیو پر سُنا دیجئے۔

(ب) "میں فلاں رئیس ابن رئیس۔ پرسوں فلاں نواب صاحب کو گارڈن پارٹی دے رہا ہوں۔ شہر کے سب رؤسا اس پارٹی میں شریک ہوں گے۔ فلاں اصحاب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مہربانی کر کے اس خبر کو براڈ کاسٹ کر دیجئے"۔

(ج) "میں راج جوتشی ہوں، بٹوہ اور برش بھل بہت عمدہ بناتا ہوں۔ میرا اعلان ریڈیو پر "دیجئے، اس کے صلے میں میں ریڈیو والوں کی جنم پتریاں مفت دیکھنے کو تیار ہوں"۔

(د) "۲۹ دسمبر کو دلفگار ڈے ہندوستان بھر میں منایا جائے گا۔ جناب دلفگار ملتانی ایک بے مثال شاعر ہونے کے علاوہ اپنے شہر کے بہترین جلد ساز بھی تھے، اُن کا دیوان ناسازگاریِ زمانہ سے معدوم ہو گیا ہے لیکن جلد باقی رہ گئی ہے۔ بسیار تلاش کے بعد پانچ شعر دستیاب ہو سکے ہیں۔ بطور تبرک اُنھیں ریڈیو پر سُنا دیجئے"۔

(ہ) "۲۹ دسمبر کو شری بیت اودے چند تار اگن کی آٹھ ہزارویں برسی ہے، یہ کوی بھارت ورش کے پہلے ترقی پسند شاعر تھے۔ انہوں نے دھات اور پتھر

کے زمانے سے پہلے وفات پائی۔ انہوں نے گھوڑے اور مچھلی پر دو شاندار نظمیں لکھی ہیں جو اجنتا کے غاروں میں کندہ ہیں لیکن اب پڑھی نہیں جاتیں، صرف گھوڑے اور مچھلی کی تصویروں کی خارجی کیفیت سے ان نظموں کا داخلی حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ازراہِ کرم ۲۴ دسمبر کو براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے ان کے متعلق ایک خاص پروگرام رکھئے۔"

ہندوستانیوں کی بزرگ پرستی تو مشہور ہے، اس لئے ہر ڈاک میں اس قسم کے خط اکثر آتے رہتے ہیں، چونکہ رائے عامہ کا احترام واجب ہے اس لئے براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر اس قسم کی "برسیاں" اکثر منائی جاتی ہیں اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ اردو، ہندی بلکہ ہر ایک صوبہ جاتی زبان کے ان تمام بڑے بڑے گویوں اور شاعروں اور ادیبوں کی یاد تازہ ہو گئی ہے جو مدت ہوئی مر کھپ چکے، جن کی نہ اپنے زمانہ میں کوئی وقعت تھی نہ اب ہے، نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔ اسی قسم کی سرگرمیوں ہی سے تو اکثر براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر بارہ مہینے نوحہ خوانی ہوتی رہتی ہے، یہی کوشش ہوتی ہے کہ مُردوں کو یاد کر کے رویا اور رُلایا جائے، جو زندہ ہیں انہیں ہنسانے کی تدبیر کوئی نہیں سوچتا۔

پروگرام کرنے والوں کی بے ہودگی کے سلسلے میں بیشمار واقعات یاد آتے ہیں۔ وہ معصوم بچے جو یہاں بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے کے لئے آتے ہیں، اور اسٹوڈیو کی دیواروں پر پنسل سے کارٹون بنانے اور اپنے اُستادوں کے چہرے مہرے درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ معزز خواتین جو اپنی تقریر کے دوران میں نہایت بھولے پن سے مائیکروفون کے قریب لگے ہوئے بٹن کو محض اس لئے دبا دیتی ہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا ہے سارا پروگرام غائب غلّہ ہو جاتا ہے! وہ علّامۂ دہر جو تقریر کرتے ہوئے یکایک قریب کھڑے ہوئے معلّن سے پانی کا گلاس مانگ لیتے ہیں اور پھر اُن کی یہ آواز بھی ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہے۔ اور ریڈیو کی بے ہودگی پر محمول کی جاتی ہے۔ یہ ایک تلخ داستان ہے اور اس کا تذکرہ

فضول۔

اور پھر وہ بزرگ ہیں جو غریب سٹینڈ بائی سے کہیں بلند و بالا ہیں، لیکن اُن کے کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے، اور کاغذ کم ہے۔ وہ لوگ سٹینڈ بائی کی منزل سے بہت دور ہمالہ ایسی بلندیوں پر رہتے ہیں، اُن کے چہرے ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں، وہاں سورج کی چمک اور دُھوپ کی مسکراہٹ شاذ ہی دکھائی ہے ورنہ اکثر ایک میلا کہرہ ہر وقت چھایا رہتا تھا، وہاں تیز و تند ہوائیں چلتی ہیں اور برفیلے طوفان آتے ہیں، وہاں تک پہونچنا جان جوکھوں کا کام ہے، آج تک کئی مہمات بھیجی جا چکی ہیں لیکن حاتم طائی والے قصّے کے کوہ ندا کی طرح جو شخص ایک دفعہ وہاں گیا پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

عِلم مستطحات

(مبتدیوں کے لئے)

نقطہ:۔ وہ شئے لطیف ہے، جس کی لمبائی، چوڑائی، گہرائی بالکل نہیں ہوتی. نقطہ جسامت نہیں رکھتا لیکن پھر بھی نظر آتا ہے. خدا کی طرح ہر اک شئے میں نقطہ کا جلوہ موجود ہے.

خطِ مستقیم:۔ ایک نقطے سے جو خط جس سمت چاہے کھینچ دیا جائے، اُسے خطِ مستقیم یا سیدھا خط کہتے ہیں.

ٹیڑھا خط اُسے کہتے ہیں جو پڑھا نہ جا سکے.

ٹیڑھی کھیر اُسے کہتے ہیں جو کھائی نہ جا سکے.

نقطہ نقطہ کر کے خط ہوتا ہے، جس خط میں نقطے نہ ہوں، اُسے بے نقط بولتے ہیں. مثلاً حرامی، سالا، اُلّو، گدھا.

خطوط متوازی:۔ جب دو خطوط آمنے سامنے برابر کا فاصلہ درمیان میں رکھ کر کسی ایک

سمت کو چلتے ہیں تو وہ خطوطِ متوازی کہلاتے ہیں۔ اگر دو آدمی اسی طرح
چلیں تو انہیں "حریف" کہا جاتا ہے۔
اگر چار آدمی اسی طرح چلیں تو اُسے مستطیل کہتے ہیں۔ جہاں ان چار آدمیوں
کے سر ٹکراتے ہیں اُسے "حادثہ" کہتے ہیں۔
اگر کوئی محبوب اس مستطیل میں گھر جائے تو اس کا بُرا حال ہوتا ہے۔
علمِ مستطحات میں اُسے "مربع" کہتے ہیں۔ اور عامۃ الناس کی زبان میں "مربّا"
ادب کی اصطلاح میں اسے "ٹریجڈی" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اقلیدس نے
بڑی کاوش کے بعد معلوم کیا ہے کہ اگر دو حریف ایک دوسرے سے بدرجۂ
زاویہ قائمہ رقابت رکھتے ہیں اور ایک ہی محبوب کو چاہتے ہوں تو ایسی
تثلیث میں محبوب کا مربّا مساوی ہوتا ہے، دونوں حریفوں کے مربّے کے۔
لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ مربّے مساوی نہیں ہوتے تو پھر ظاہر ہے کہ
یہ دونوں مربّے غیر مساوی ہوں گے! جو کہ بالکل غلط ہے۔
مثلّث :۔ اقلیدس کی ایک ایسی شکل کو کہتے ہیں جو تین ارکان سے مل کر بنتی ہے۔
ہیرو، ہیروئن اور رقیب۔ نتیجہ شادی، طلاق یا خودکشی۔ جب بہت سے
مثلّث مل جاتے ہیں تو فلم کمپنی بن جاتی ہے۔
اگر کسی مثلّث کی چوٹی پر سے ایک ایسا عمود گرایا جائے کہ ہیروئن کے دل کو
چیرتا ہوا مثلّث کے باہر چلا جائے تو وہ فلم کمپنی ٹوٹ جاتی ہے۔
عمود :۔ عمود اسی خطِ مستقیم کو کہتے ہیں۔ جو مثلّث، مستطیل یا مربع کی سطح پر گرایا
جاتا ہے۔ عمود خود کبھی نہیں ٹوٹتا لیکن جس سطح پر گرتا ہے، اُسے ضرور توڑ دیتا ہے۔
زاویئے :۔ جب ایک مرد ایک عورت کو یا ایک عورت ایک مرد کو ترچھی نظروں سے
دیکھتی ہے، اسی حالت حال کو زاویہ کہتے ہیں۔

زاویوں کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) زاویہ (۲) زاویہ قائمہ (۳) زاویہ منفرجہ۔

(۱) زاویہ ــــ اس نگاہ کو کہتے ہیں۔ جو دل کے پار ہو جائے۔

(۲) اگر یہ نگاہ دل میں اٹک جائے تو سمجھ لو کہ زاویہ قائمہ ہوا ہے۔

(۳) جب دو رقیب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو زاویہ منفرجہ پیدا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ جو زاویئے آپ کو نظر آئیں وہ سب نئے زاویئے ہیں۔ ان میں مزدور، کسان، انقلاب اور طوائف شامل ہیں، نئے زاویئے کا موجد کرشن چندر ہے۔

دائرہ:۔ اُس حلقے کا نام ہے جس کے اندر داخل ہو کر آدمی پھر کبھی باہر نہیں نکل سکتا۔ مثلاً حلقۂ اربابِ فکر لاہور، سنٹرل جیل لکھنؤ۔ بھول بھلیاں قلعہ آگرہ۔

دائرے کی لمبائی چوڑائی نہیں ہوتی صرف گولائی ہوتی ہے۔

محور:۔ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے گرد دائرہ گھومتا ہے۔ مثال کے طور پر محبوب۔ شہرت۔ روپیہ۔

قطر:۔ قُطر دائرے کے سکریٹری، دربان یا چوکیدار کو کہتے ہیں۔ دائرہ قطر کے بغیر نہیں جی سکتا۔ جس دائرے میں قطر نہ ہو گا وہ فوراً ٹوٹ جائیگا۔ جس دائرہ کا قطر جتنا بڑا ہو گا وہ دائرہ اسی تناسب سے بڑا ہو جائیگا۔

وہ دائرہ جو اپنے محور پر آپ ہی آپ گھومتا ہے اُسے سیّارہ کہتے ہیں۔ مثلاً آل انڈیا ریڈیو۔

دائرے کی تعریف و تشکیل کے مطالعے سے جو کلیّے برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(الف) اجرام فلکی میں سیّارے بہت کم ہیں۔

(ب) بڑا دائرہ ہمیشہ چھوٹے دائرے کو کھا جاتا ہے۔

(ت) جب بہت سے دائرے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو سٹراند پیدا ہو جاتی ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔

(ج) ایسی جگہ پر فوراً فنائل چھڑک کر کسی کل ہند کانفرنس کا انعقاد کر دینا چاہیئے۔

ابتدائی مشق

اگر کسی تحریر میں خطِ مستقیم اور ٹیڑھے خطوط کا تناسب ۱ : ۴ ہو تو وہ تحریر کس زبان میں ہوگی اور کیا کوئی منشی کاتب اُسے پڑھ بھی سکے گا؟

....

....

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ اور کونسے سیّارے ہیں۔ اُن کے نام بتاؤ اور ہجے یاد کرو۔

اختلاجِ قلب میں کون مربّا بہتر رہیگا۔ سیب کا یا محبوب کا؟

اگر کسی مثلث میں ہیروئن کا رقبہ ہیرو اور رقیب کے مجموعی رقبے کے برابر ہو تو اس مثلث کو کیا کہیں گے۔ ایسی مثلث سے ہندوستان کی آبادی میں کتنا اضافہ ہوگا؟۔ جواب سوچ کر لکھو۔

بدصورت راجکماری

(ایک تخیلّی کامیڈی)

(کردار)

۱. راجکمار اودے سنگھ
۲. راجکماری چندرا
۳. مہاراجہ اگرسین اگنی ہوتری والیِ سنگدیپ
۴. مہارانی
۵. وزیر
۶. بانجھ
۷. چھیرا
۸. چوبدار

(گھوڑے کی ٹاپ سنائی دیتی ہے۔ دور سے قریب، پھر رُک جاتی ہے)

اودے سنگھ:۔ پانچو۔

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے سنگھ:۔ میرا نام کیا ہے؟

پانچو:۔ اودے سنگھ مہاراج۔

اودے سنگھ:۔ کس دیس کا راجکمار ہوں؟

پانچو:۔ سنگلدیپ کا۔

اودے:۔ کہاں جا رہا ہوں؟

پانچو:۔ درشن دیپ کی راجدھانی۔

اودے:۔ کیوں جا رہا ہوں؟

پانچو:۔ بیاہ کرنے۔

اودے:۔ کس سے؟

پانچو:۔ درشن دیپ کی راجکماری چندرا سے۔

اودے:۔ بہت خوب۔ گھوڑا آگے بڑھاؤ۔ (گاتا ہے)

میں ہوں سنگلدیپ کا راجکمار۔

(گھوڑے کی ٹاپ دور چلی جاتی ہے، پھر قریب آنا شروع ہوتی ہے۔

رُک جاتی ہے۔)

(گاتے گاتے رُک جاتا ہے)

اودے:۔ پانچو۔

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے:۔ کیا راجکماری چندرا حسین ہے؟

پانچو:۔ جی سرکار، سُنا ہے کہ وہ پریوں سے بھی زیادہ حسین۔ کم از کم راج پروہت
تو یہی کہتا تھا۔

اودے:۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

پانچو:۔ جی، مجھے تو اپنی بیوی پسند ہے۔

اودے:۔ (گرج کر) پانچو!

پانچو:۔ جی سرکار!

اودے:۔ گھوڑا آگے بڑھاؤ۔

اودے سنگھ:۔ (گاتا ہی اے درشن دیپ کی راجکماری، اے درشن دیپ کی راجکماری۔
(گاتے گاتے رُک جاتا ہے)

اودے:۔ پانچو۔

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے:۔ کیا مَیں خوبصورت ہوں؟

پانچو:۔ سورج کی طرح۔

اودے:۔ کیا مَیں بہادر ہوں؟

پانچو:۔ شیر کی طرح۔

اودے:۔ کیا مَیں عقلمند ہوں؟

پانچو:۔ وزیر کی طرح۔

اودے:۔ لیکن پانچو۔

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے:۔ اگر راجکماری نے مجھے پسند نہ کیا؟

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے۔ اگر میری صورت اُسے پسند نہ آئی۔ اگر اُس نے میری صورت میں سورج کی چمک کی بجائے رات کی سیاہی دیکھی؟

پانچو۔ جی سرکار۔

اودے۔ اگر اُس نے میری بہادری میں شیر کے بجائے گیدڑ کی جھلک دیکھی؟

پانچو۔ جی سرکار۔

اودے۔ اگر اُس نے میری عقلمندی میں وزیر کے بجائے گدھے کا دماغ پایا؟

پانچو۔ جی سرکار۔

اودے۔ پانچو!

پانچو۔ جی سرکار۔

اودے۔ اپنے گھوڑے سے اُتر کر میرے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں۔

(گھوڑے کی ٹاپ دُور ہو جاتی ہے، پھر قریب آنا شروع ہوتی ہے۔ قریب آکر رُک جاتی ہے) (وقفہ)

اودے۔ پانچو۔

پانچو۔ جی سرکار۔

اودے۔ اچھا بتاؤ تم کون ہو؟

پانچو۔ پانچو، جی سرکار۔

اودے۔ جی سرکار کے بچے، اب تم پانچو نہیں، راجکمار اودے سنگھ ہو، سنگل دیپ کے راجکمار۔ تم راجکماری چندرا سے بیاہ کرنے جا رہے ہو۔ تمہارا خوبصورت چہرہ اور تنومند جسم دیکھ کر دشن دیپ کے ہر فرد کا دل باغ باغ ہو اُٹھے گا ——— لیکن یاد رکھو، تم راجکمار اودے سنگھ ہو صرف بیاہ کی رات تک۔ اسکے بعد ———

پانچو:۔ پھر وہی پانچو کا پانچو سرکار۔

اودے:۔ ٹھیک ہے تم میں ہمارے وزیر کی ساری فراست کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ افسوس کہ آج کل کے راجکمار نوکر لگتے ہیں اور نوکر راجکمار۔

پانچو:۔ جی سرکار۔

اودے:۔ خاموش، گھوڑا آگے بڑھاؤ۔

(گھوڑے کی ٹاپ۔ فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن چوبدار۔ چوبدار ہمیشہ پُرانے اسٹیج کے انداز میں بولتا ہے۔ بہت بھاری آواز۔)

(چوبدار کے ہاتھ میں عصا ہے جس سے وہ کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتے ہوئے آتا ہے۔)

چوبدار:۔ وزیرِ اعلیٰ، مہاراج ادھیراج والیِ درشن دیپ شری اگرسین اگنی ہوتری کی خدمت میں شرفِ باریابی چاہتے ہیں۔

مہاراج:۔ تمہارا مطلب ہے کہ وزیر صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ سیدھی طرح بات کرو۔ یہ اس قدر الل بل سے کام کیوں لیتے ہو۔ اچھا اُنہیں بُلاؤ۔

چوبدار:۔ مہاراج ادھیراج والی درشن دیپ شری اگرسین اگنی ہوتری کی خدمت میں یہ غلام التجا کرتا ہے کہ قصور معاف ہو غلام بہت پُرانا چوبدار ہے اور شروع سے ایسی ہی عبارت بولنے کا عادی ہے۔ جان بخشی ہو۔

مہاراجہ:۔ اچھا اچھا۔ وزیر صاحب کو اندر بُلالاؤ۔

(عصا سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا چوبدار جاتا ہے)

وقفہ

مہاراج:۔ کیا مصیبت ہے۔ گدھا۔ پاجی۔ جاہل۔ نالائق، بے عقل۔ (وزیر کا داخلہ)

وزیر:۔ خطا معاف ہو۔ غلام کورنش بجا لاتا ہے۔ حضور کے دہن مبارک سے میں یہ کیا الفاظ سُن رہا ہوں۔

مہاراجہ:۔ گالیاں۔

وزیر:۔ گالیاں؟ گالیاں؟ نہیں، نہیں۔

مہاراجہ:۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

وزیر:۔ نہیں، نہیں۔ جھوٹ تو حضور کے دشمن بولتے ہیں۔ اے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ مہاراج جب آپ گالیاں بھی دیتے ہیں، تو بھی معلوم ہوتا ہے۔ گویا دہن مبارک سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مہاراجہ:۔ عجیب گدھوں سے پالا پڑا ہے۔ بتائیے، کیا کام ہے۔ آپ کو۔ مَیں اس وقت کچھ سوچ رہا تھا۔

وزیر:۔ اے حضور۔ سوچنے سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے حضور مَیں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

مہاراج:۔ کیا سوچ رہے تھے؟

وزیر:۔ اے حضور، بس یہی۔ سنگلدیپ راج کی سب سے بڑی مشکل کے متعلق۔

مہاراج:۔ تمہارا مطلب ہماری بیٹی سے ہے؟

وزیر:۔ اے نہیں، نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہاں راجکمار اودے سنگھ آج یہاں پہنچ جائینگے۔ وہ راجکماری چندرا سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کئی سالوں سے سمندر پار دُور ملکوں میں گھومتے گھامتے آرہے ہیں، اور جیسا کہ میں نے سنا ہے کہ اُنہوں نے.... اُنہوں نے.......

مہاراج:۔ تمہارا مطلب ہے کہ اُنہوں نے راجکماری چندرا کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں سُنا ہے۔

وزیر:۔ مہاراج اس کو ذرا ٹھیک طرح بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن ——

مہاراج:۔ تم کوشش کرو، مَیں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

وزیر:۔ غلام عرض کرتا ہے کہ فی زمانہ، در اصل یہ امر لابدی ہے کہ راجکمار اودے سنگھ اپنے دل میں یہ یقین کامل رکھتے ہوں گے کہ مہاراج ادھیراج والیِ سنگلدیپ شری اگرسین اگنی ہوتری کی سپتری راجکماری اپنے اطوار اور کردار میں وہ تمام اوصاف میری ناچیز رائے ہے، وہ تمام روایتی، گویا کہ ایک طرح سے لابدی۔ الغرض وہ تمام خصائل حمیدہ گویا کہ جو ایک راجکماری کے لئے فی زمانہ، دریں حالات میں گویا کہ چونکہ ——

مہاراج:۔ مَیں سمجھ گیا۔ تم کہنا چاہتے ہو کہ میری بیٹی خوبصورت نہیں ہے۔ ہے نا!

وزیر:۔ اے ہاں۔ نہیں، نہیں۔ یہ مطلب یہ تھا مہاراج۔ کہ راجکماری کی خوبصورتی ایسی انوکھی وچتر، بظاہر نظر نہ آنے والی۔

مہاراج:۔ ہاں ٹھیک ہے، اُس کی خوبصورتی کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ مجھے نظر نہیں آئی، تمہیں نظر نہیں آئی، ہر اُس شخص کو جس نے اُسے ایک بار بھی دیکھا ہے، نظر نہیں آئی، حد تو یہ ہے کہ شاہی مصوّر کو بھی یہ نظر نہیں آئی۔ اور جب میں نے راجکماری کی تصویر دیکھ کر اُس بیچارے کے قتل کا حکم دیا۔ تو اُسکے آخری الفاظ تھے۔ مہاراج، میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

وزیر:۔ جی ہاں، اے حضور میں تو یہ کہنا ہی بھول گیا کہ اس کا جانشین یعنی شاہی مصوّر کا جانشین آج کل پائیں باغ کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ کہتا ہے۔ اس کے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ صرف قدرتی نظاروں کی تصویریں بنایا کرے۔

مہاراج:۔ اس کا ڈاکٹر عقلمند معلوم ہوتا ہے۔

وزیر:۔ جی ہاں، یہ بڑی حیرت کی بات ہے، مہاراج، سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیسے ہوا۔

مہاراج:۔ تمہارا۔ تمہارا کہیں یہ مطلب تو نہیں، کہ راجکماری کی صورت اپنے باپ پر گئی

ہے۔ تم نے میری اور راجکماری کی صورت میں کوئی مشابہت تو نہیں دیکھی کہیں؟

وزیر:۔ بالکل نہیں حضور۔ قطعاً نہیں۔ مہاراج۔ مطلق نہیں۔

مہاراج:۔ سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ تم سے پہلے جو ہمارا وزیر تھا اُس نے ایک بار اِس مشابہت کا ذکر کیا تھا۔

وزیر:۔ مہاراج میں کئی بار سوچتا ہوں، اس وزیر کا کیا بنا۔

مہاراج:۔ قیمہ۔

وزیر:۔ آہ ــــ بیچارہ ..... لیکن مہاراج اگر راجکماری بظاہر خوبصورت نہیں تو کیا ہوا۔ سب دُنیا جانتی ہے کہ۔ کہ راجکماری کا چال چلن دن کے سورج کی طرح روشن اور رات کی شبنم کی طرح پاک ہے۔ اس کا دل تو خوبصورت ہے۔

مہاراج:۔ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ میاں آج کل کے راجکمار یہ نہیں دیکھتے کہ فلاں راجکماری کا دل کیسا ہے یا اسکے پھیپھڑوں کی کیا حالت ہے۔ وہ یقین کر لیتے ہیں کہ اگر کسی لڑکی کا چہرہ خوبصورت ہے، تو اُس خوبصورت چہرہ کے پیچھے چھپا ہوا ایک خوبصورت دل بھی ہوگا۔ لیکن یہ کون باور کرے گا کہ ایک خوبصورت دل کے پیچھے ایک چہرہ بھی چھپا ہوگا۔ یہ ناممکن ہے چہرے کو تو دل کے باہر، بلکہ جسم کے باہر ہونا چاہیئے نا، جہاں اسکی ضرورت ہے۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ خوبصورت چال چلن اور خوبصورت چہرے میں بہت فرق ہے۔ سمجھ گئے؟

وزیر:۔ جی ہاں، مہاراج۔

مہاراج:۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ راجکماری چندرا ہمارے راج کی سب سے پیاری اور عزیز ترین ہستی ہے۔

وزیر:۔ بیشک، بیشک اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، اے، میرا مطلب ہے آپ کے سوا اور مہارانی جی کے سوا وہ ہمارے راج کی ہیرا، مطلب ہے، آپ کے سوا

وہ راج کی سب سے زیادہ پیاری اور عزیز ترین ہستی ہے۔

(مہارانی کا داخلہ)

مہارانی:۔ کیا گول مال ہو رہا ہے۔ میں بھی تو سنوں، یہ کس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ وہی میری بیٹی کا قصہ ہوگا؟

مہاراج:۔ وہی ایک ہی تو قصہ ہے۔

مہارانی:۔ یہ راج کمار اودے سنگھ آج یہاں پہونچ رہا ہے۔ اس کی شکل وصورت کیسی ہے؟

وزیر:۔ اُسے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ مہارانی صاحبہ۔

مہارانی:۔ اُس کی عمر کیا ہوگی؟

وزیر:۔ پچیس برس۔

مہارانی:۔ تب ان پچیس برسوں میں اُسے کسی نہ کسی نے ضرور دیکھا ہوگا۔

وزیر:۔ میرا مطلب یہ تھا، مہارانی صاحبہ، کہ اس کی شکل وشباہت کے بارے میں کوئی مصدقہ تفصیلات ہمارے پاس نہیں پہنچی ہیں، ماسوا اسکے کہ وہ راجکمار اودے سنگھ ہے۔ سنگلدیپ کا وارث۔ سمندر پار ملکوں میں سے گھومتا ہوا اِدھر آرہا ہے۔ اور ایک راجکمار کی تمام صفات کہ فی زمانہ دریں حالات ——

مہارانی:۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں، وہ دیکھنے میں کیسا ہے، کانا تو نہیں، لنجا یا بہرہ، یا اسی قسم کی کوئی اور صفت جو آجکل اکثر راجکماروں میں فی زمانہ دریں حالات ——

وزیر:۔ نہیں، مہارانی صاحبہ۔ اس کے متعلق ابھی تک کوئی مصدقہ اطلاع فراہم نہیں ہوئی۔ اسکے علاوہ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کہ راجکماری چندرا کا چال چلن دن کے سورج کی طرح روشن اور رات کی شبنم کی طرح پاک۔

مہارانی:۔ بکواس۔ ان باتوں کو بار بار دُہرانے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے پچھلے

سوئمبر میں کیا ہوا تھا؟

وزیر:۔ نہیں مہارانی صاحبہ۔ مَیں ان دنوں یہاں موجود نہ تھا۔ سمندر پار ملکوں کی سیاحت میں مصروف تھا۔

مہارانی:۔ آں ہاں، یاد آیا، ان دنوں وہ دوسرا بے وقوف تھا۔ اچھا تو مَیں کیا کہہ رہی تھی مہاراج۔

مہاراج:۔ تم راج کماری کے پچھلے یعنی ٹھیک حساب کیا جائے تو آٹھویں سوئمبر کی بات کر رہی تھیں۔ آٹھواں سوئمبر تھا وہ۔ کیوں وزیر؟

وزیر:۔ آپ بجا فرماتے ہیں مہاراج۔

مہارانی:۔ آٹھواں کیا ہوگا۔ ساتواں سوئمبر تھا، وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ساتواں سوئمبر تھا، کیوں وزیر؟

وزیر:۔ آپ ٹھیک فرماتی ہیں۔ مہارانی صاحبہ۔

مہاراج:۔ اگر ہم دونوں ٹھیک کہتے ہیں۔ تو پھر غلط کون کہتا ہے؟

وزیر:۔ حساب۔ حساب غلط ہو گا ضرور۔ آپ سوچئے نا۔ اگر راجکماری اپنے سات سوئمبر رچائے اور ساتوں ناکام ثابت ہوں، یعنی وہیں کے وہیں پڑے رہیں، تو سات سوئمبر ہوئے نا کُل۔ لیکن اگر اُن پر سُود در سُود لگایا جائے تو بھی سوئمبر ایک سال کے عرصے میں آٹھ ہو جاتے ہیں۔ سات جمع ایک۔ کُل آٹھ ہوئے۔ آپ جانتے ہیں وردشن دیپ کے راج میں سوئمبروں پر بھی سُود لگتا ہے۔ لیکن دراصل ہیں وہ سات ہی، لیکن سُود لگا کر آٹھ۔ گویا سات، آٹھ۔ سات۔ آٹھ۔

مہاراج:۔ آہ ـــــ یہ بات۔ ایں لیکن یہ سود کون ادا کرتا ہے، کون ادا کرتا ہے؟ کیا میری ذاتی جاگیر۔ میری تلوار کہاں ہے۔ میری تلوار کہاں ہے۔ چوبدار!

وزیر:۔ نہیں حضور، سرکاری خزانے سے، آٹھ کیا اگر آٹھ ہزار سوئمبر ہوں تو بھی سرکاری

خزانہ سے سُود ادا ہو گا۔

مہاراج:۔ تب تو ٹھیک ہے۔

چوبدار:۔ حضور یہ چوبدار، ناچیز غلام، مہاراج ادھیراج والیِ درشن دیپ شری اگر سین اگنی ہوتری کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہے۔ حضور کے حکم عالیہ سے سرفراز ہونے کا متمنّی ہے۔

مہاراج:۔ کچھ نہیں۔ اب چلے جاؤ۔ تلوار کی ضرورت نہیں رہی۔ ہاں یہ بتاؤ پرماتما کے لئے سیدھے سادے سارے لفظ بولا کرو۔ کیا کہتے ہو تم؟

چوبدار:۔ غلام پُرانا چوبدار ہے اور شروع سے ایسی ہی عبارت بولنے کا عادی ہے۔ بندگانِ عالی کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہے۔

مہارانی:۔ ہاں تو مَیں کہہ رہی تھی، کہ راجکماری کے پچھلے سوئمبر پر دُور دُور سے راجکمار آئے تھے، ہم نے راجکماری کو ایک بالکونی میں کھڑا کیا تھا۔

مہاراج:۔ راجکمار گھوڑوں پر سوار ہو کر بالکونی کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ یہ پہلی بار تھی کہ انہوں نے راجکماری کو دیکھا تھا۔ شرط یہ تھی کہ راجکماری کے درشن کے بعد راجکمار گھوڑ سواروں کا مقابلہ ہو گا اور جو راجکمار جیت جائے گا وہ راجکماری کا حقدار ہو گا۔

مہارانی:۔ اور ہوا یہ کہ راجکماری کو دیکھنے کے بعد وہ سب لوگ جو مقابلے کے لئے آئے تھے، لڑائی سے جی چُرانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ جب لڑائی شروع ہوئی سب کے سب اپنے گھوڑوں سے نیچے اُتر پڑے اور یہ ظاہر کرنے لگے، جیسے اُنکے حریف نے انھیں شکست دیدی ہو۔

مہاراج:۔ لیکن ان میں سے ایک نے گھوڑے سے اُترنے میں ذرا دیر کی۔ فوراً اُس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا تھا میں نے اُسے وہیں گھوڑے کی پیٹھ پر روک دیا۔

اور اُسے وجئے اور راجکماری کا حقدار قرار دیا۔

مہارانی :۔ اور اس راج محل میں بواہ کے رسم سے پہلے جو دعوت ہوئی اس میں ہمارے راج کے دستور کے مطابق راجکمار کو ایک سوال کا ٹھیک جواب دینا تھا لیکن جب اس سے یہ سوال پوچھا گیا تو اُس نے اُس کا ٹھیک جواب نہ بتایا۔

مہاراج :۔ بیچارے نے کوشش تو بہتیری کی۔

مہارانی :۔ کوشش، وہ بتانا ہی نہ چاہتا تھا۔ سوال بالکل آسان تھا۔ وہ کونسا جانور ہے جسکے چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور بھونکتا ہے ایک کتے کی طرح، جواب ہے ایک کتا۔

مہاراج :۔ لیکن وہ اس آسان سوال کا جواب بھی نہ بتا سکا۔ پہلے اس نے کہا۔ ایک طوطا پھر کہا سانپ، ایک چیل، ایک اونچا پہاڑ اور مور، چاندنی رات۔ ہزار کوشش پر بھی کتے کا نام وہ نہ لے سکا۔

وزیر :۔ پھر کیا ہوا سرکار۔

مہاراج :۔ دوسرے روز وہ قلعے کی خندق میں پایا گیا۔

وزیر :۔ وہاں کیا کر رہا تھا، مہاراج ؟

مہاراج :۔ پتہ نہیں، خندق کے گہرے پانی میں اُس کا جسم تیرتا ہوا نظر آیا۔ بعض لوگوں کو مرنے کے بعد بھی تیرنے کا شوق باقی رہتا ہے۔

(راجکماری کا داخلہ۔ بھاگتی ہوئی آتی ہے۔ شروع میں اس طرح باتیں کرتی ہے جیسے دم بھول گیا ہو۔)

راجکماری :۔ پتاجی۔ پتاجی۔ دیکھئے پائیں باغ میں مصوّر کیسی اچھی تصویر بنا رہا ہے۔

مہاراج :۔ تمہاری !

راجکماری :۔ نہیں ایک مور اور مورنی کی۔ آہا کیسی پیاری تصویر ہے۔

مہارانی :۔ چندرا !

راجکماری :۔ جی ماتا جی!

مہارانی :۔ تمہیں معلوم ہے کہ راجکمار اودے سنگھ آج آ رہے ہیں؟

راجکماری :۔ وہ تو آ بھی چکے۔ ماتا جی، ابھی میں نے لوہے کا پُل خندق پر گرتا ہوا دیکھا تھا۔

وزیر :۔ تب تو مجھے بھی چلنا چاہیئے۔

راجکماری :۔ لیکن ابھی تو دیر ہے۔ اُس پُل کو خندق پر رکھتے ہوئے بھی تو ایک آدھ گھنٹہ ضرور صرف ہو گا۔

وزیر :۔ جی ہاں آپ ٹھیک فرماتی ہیں۔ غالباً اُس پُل کے کل پرزوں میں مدت سے تیل نہیں دیا گیا۔

مہاراج :۔ وزیر! تم جا کر سب انتظام کرو۔

وزیر :۔ بہت اچھا سرکار! (وزیر چلا جاتا ہے)

مہارانی :۔ کیا وزیر کو وہ بات بتا دی گئی ہے؟

مہاراج :۔ نہیں تو۔ میں در اصل بات کرنے والا ہی تھا۔ کہ ——

مہارانی :۔ اچھا تو مَیں وزیر کو جا کر اس بارے میں سب کچھ سمجھا بجھا دیتی ہوں آپ چندرا سے بات کر لیں۔

مہاراج :۔ ابھی؟

مہارانی :۔ اسی وقت، اور کوئی راستہ نہیں ہے اس مشکل سے نکلنے کا۔

(مہارانی چلی جاتی ہے)

مہاراج :۔ چندرا! میں تم سے تمہاری شادی کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔

راجکماری :۔ مَیں سن رہی ہوں، پتا جی۔

مہاراج :۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم زندگی کی دو چار سچائیوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔ پہلی بات

تو یہ ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد ہی آدمی زندگی کی سچی خوشی سے واقف ہوتا ہے۔
ہمارے ملک کی ہسٹری یہی بتلاتی ہے۔

راجکماری:۔ اور آپ کا تجربہ بھی یہی ہو گا۔

مہاراج:۔ میں اس وقت ہسٹری کا ذکر کر رہا ہوں، اپنے تجربے کا نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کہیں ایک آدھ مثالیں ایسی مل جائیں جس میں شادی کے بعد اُن کو خوشی نصیب نہ ہو لیکن یہ ایک آدھ مثالیں ہیں صرف انسانوں کی اکثریت شادی کے بعد ——

راجکماری:۔ میں سمجھ گئی پتا جی۔

مہاراج:۔ تم بہت سمجھدار ہو۔ در اصل بات یہ ہے کہ تمھیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہیئے کہ تم کس سے شادی کر رہی ہو۔ اور کس طرح شادی کر رہی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ تم شادی کر رہی ہو اور شادی کے بعد تم ہمیشہ خوش رہو گی۔

راجکماری:۔ جی ہاں! پتا جی!

مہاراج:۔ تو اس سلسلے میں میں نے اور تمہاری ماتا جی نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ وہ تمہاری نوکرانی جو ہے نا!

راجکماری:۔ کونسی۔ یوں تو میرے پاس بہتیری نوکرانیاں ہیں۔

مہاراج:۔ میرا مطلب ہے، جو سب ہی سے۔ سب سے زیادہ۔ میرا مطلب ہے بہت ہی سندر دکھائی دیتی ہو۔

راجکماری:۔ چھپرا؟

مہاراج:۔ ہاں! ہاں! وہی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پہلی ملاقات کے وقت جب راجکمار تمہارے درشن کرے گا۔ تو۔ تو میرا مطلب ہے کہ تمہاری جگہ چھپرا ہو گی اور تم چھپرا کی جگہ۔ شادی کی رسموں سے پہلے ہم اسے راجکماری چندرما بنائے رکھیں گے، تاکہ،

تاکہ ــــ الغرض اس سے راجکمار کو شادی کرنے میں آسانی ہو گی۔ عین شادی کے وقت تو خیر تمہارے چہرے پر گھونگھٹ پڑا ہو گا جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھونگھٹ کی رسم کیسے پیدا ہوئی۔ خیر یہ تو ایک غیر متعلق بات تھی۔ اصل چیز یہ ہے کہ بیاہ کی رسم تک تمہیں اپنے آپ کو راجکماری نہیں بلکہ راجکماری کی نوکرانی ثابت کرنا ہو گا۔ سمجھ گئیں۔ اب تم جاؤ۔ میں نے تمہاری نوکرانی چھپرا کو بلوایا ہے تاکہ اُسے بھی سب باتیں سمجھا دوں۔ اب تم جاؤ۔ باغ میں کھیلو۔ شاہی مصوّر کی تصویریں دیکھو۔ (راجکماری چلی جاتی ہی)

چوبدار :- راجکماری چندرا کی خادمہ چھپرا مہاراج ادھیراج والی ......

مہاراج :- (طنز سے) درشن دیپ شری اگر سین ہوتری کی خدمت میں شرف باریابی کی خواہاں ہی۔ ہاں۔ اُسے فوراً اندر بھیجدو۔

چھپرا :- سرکار! میں حاضر ہوں۔

مہاراج :- بیٹھو چھپرا، یہاں اس مسند پر۔ اُمید ہی کہ تمہیں مہارانی نے سب باتیں بتادی ہوں گی، کہ راجکمار اودے سنگھ آئیں گے تو تمہیں کیا کرنا ہو گا۔ ایک بار پھر سمجھ لو! اچھا اب تم یہ جان لو، کہ میں راجکمار اودے سنگھ ہوں۔

چھپرا :- اوئی (ہنستی ہی)

مہاراج :- اور تم راجکماری چندرا ہو۔ خوبصورت چندرا۔ جسے آج تک راجکمار اودے سنگھ نے نہیں دیکھا۔

چھپرا :- اوئی۔ (ہنستی ہی)

مہاراج :- دیکھو چھپرا۔ یہ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا موقعہ ہے۔ یہ ہنسی تمہیں اس وقت کوئی مدد نہ دے گی، سنجیدگی سے بیٹھو، اس طرح شاہانہ وقار سے، میں اس دروازے سے اندر داخل ہوتا ہوں، چوبدار میرا نام پکارتا ہے ۔ سنگلدیپ کے یوراج

راجکمار شری اودے سنگھ مہاراج"!

چھیرا:۔ (ہنستی ہے)

مہاراج:۔ ہنسو نہیں، منہ بند کرو۔ آنکھیں بند نہ کرو۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لاؤ۔ ایک سحر افروز دور کی نگاہ ـــــ اور دور کی نگاہ ـــــ اب تم بہت دور چلی گئی ہو ـــ میرا مطلب ہے کہ آنکھوں میں ایک ایسی پیاری سی چمک، ایک ایسی نگاہ۔ جیسے تمہارا دھیان یہاں نہیں ہے۔ کہیں اور ہے۔ اب میں تمہارے پاس آتا ہوں، تم اپنا ہاتھ بڑھاتی ہو ـــ ارے مجھے دھکا کیوں دیتی ہو ـــــ ـــــ ہاں! اب ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہتا ہوں، راجکماری یہ میری زندگی کا، یعنی کہ میرا مطلب ہو کہ اس جیون کی نیا کا۔ گویا کہ پریم کی ندی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اچھا وہ خود کہہ لیگا۔ میرا مطلب ہے کہ راجکمار تم سے خود کچھ کہے گا۔ اور پھر وہ اس کے بعد تمہارا ہاتھ چُوم کر اپنے دل پر رکھے گا۔ اور پھر ـــ پھر ـــ تم کیا کہو گی۔

چھیرا:۔ اوئی (ہنستی ہے)

مہاراج:۔ ہی، ہی، ہی، نہیں۔ یہ اصطبل نہیں ہے۔ شاہی محل ہے۔ دراصل تمہیں کہنا ہوگا۔ آہ راجکمار!

چھیرا:۔ آہ راجکمار!

مہاراج:۔ اتنا اونچا نہیں۔ ممکن ہو وہ بہرہ نہ ہو، اور تمہیں اس قدر چلّانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ میرا خیال ہے وہ اس قدر بہرہ نہ ہوگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ان دو لفظوں کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرو۔ ایک آہ کے ساتھ آہستہ آہستہ جیسے آسمان میں دو خوبصورت کبوتریاں اڑ رہی ہوں!

چھیرا:۔ آہ راجکمار!

مہاراج :- میں نے کبوتریاں کہا تھا، ہاتھی نہیں۔ بہرحال۔ اب جیسا بھی ہو۔ سنو۔ چھپرا تمہیں کسی سے پریم ہے۔

چھپرا :- اوئی۔ (ہنستی ہے) ایک سپاہی ہے، شاہی گارد میں ہے۔ مہارانی جی کے باہر اُس کا پہرہ ہے۔ گھسٹو اس کا نام ہے۔ ابھی تو اس کی نوکری بھی پکی نہیں ہوئی۔ راج سنگھ جو چھٹی پر گیا ہوا ہے نا۔ اس کی جگہ کام کر رہا ہے۔ مگر گارد کا بڑا افسر کہتا تھا کہ گھسٹو کام بڑا اچھا کرتا ہے۔ لہٰذا۔ اُسے گارد میں ایک اور آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے اگر ــــــ

مہاراج :- بس۔ اب ٹھیک ہے سُنو۔ جب تم راج کمار اودے سنگھ سے ملو۔ تو بس اتنا خیال رکھنا کہ اپنے ذہن میں ہر وقت گھسٹو کا دھیان رہے۔ اس کی شکل و صورت اُس کی باتیں، اُس کی لگاوٹیں، اس کا تمہاری طرف دیکھنا۔ تمہارا اُسے دیکھکر لجانا، شرمانا، بات بات پر شرم سے پانی پانی ہو جانا۔ اگر یہ سب باتیں تم دھیان میں رکھو گی تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا اور تمہارے گھسٹو کو بھی پکی نوکری مل جائے گی۔

(فیڈ آؤٹ ختم)

(فیڈ ان۔ راجکمار گاتا ہوا دور سے قریب)

راجکمار :- (گاتا ہوا) میں ہوں سنگلدیپ کا راجکمار۔ میں ہوں سنگلدیپ کا راجکمار۔

(سیٹی بجاتا ہے)

راجکماری چندرا :- اوہ!

راجکمار :- (سیٹی بجاتا ہے)

راجکماری چندرا :- تم کون ہو، یہاں اس باغ میں کیسے آئے۔

راجکمار :- ذرا بیٹھ جاتے دو کہیں۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ اطمینان سے سناؤں گا۔

راجکماری :- لیکن تمہیں پتہ نہیں، یہ شاہی باغ ہے۔

راجکمار:۔ اچھا، بہت خوب، خوبصورت باغ ہے۔

راجکماری:۔ تم کون ہو، تمہارا نام کیا ہے؟

راجکمار:۔ میرا نام پانچو ہے، اور تم؟

راجکماری:۔ میں چھپ رہا ہوں۔

راجکمار:۔ بہت خوب، آؤ ذرا اس مرمر کے تخت پہ بیٹھ جائیں۔

راجکماری:۔ لیکن یہاں تو راجہ رانی بیٹھتے ہیں۔

راجکمار:۔ کوئی مضائقہ نہیں، میں بہت دور سے آرہا ہوں۔

راجکماری:۔ اوہ۔ تم اپنی کہانی سناؤ گے نا۔ مجھے، سچ مچ، مجھے کہانیاں بہت پسند ہیں۔

راجکمار:۔ نہیں۔ دراصل یہ کوئی کہانی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ میں راجکمار اودے سنگھ کا ملازم ہوں۔ ان کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔

راجکماری:۔ اور میں راجکماری چندرا کی نوکرانی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیسے آئے۔ ابھی تو خندق کا پل ٹھیک نہیں ہوا۔ اُس کے کل پُرزوں میں تیل دیا جارہا ہے۔

راجکمار:۔ میں خندق پھاند کر آیا ہوں۔

راجکماری:۔ سچ مچ۔ کیا مشرقی دیوار کے پیپل کے پیڑ سے چھلانگ لگا کر؟

راجکمار:۔ تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟

راجکماری:۔ میں بھی کئی بار ——

راجکمار:۔ تم بھی کئی بار۔ ارے وہ تو جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔

راجکماری:۔ تمہارا جسم تو بھاری ہے، اور میں تم سے کہیں ہلکی پھلکی ہوں۔

راجکمار:۔ کتنی ہلکی ہو۔ لاؤ، دیکھیں تمہیں اٹھا کر! اوہ سچ مچ۔ تم تو بالکل پھول کی طرح ہلکی ہو، اسی طرح نازک، اتنی ہی پیاری۔ کاش میں تمہیں عمر بھر اسی طرح بازوؤں میں ——

راجکماری:۔ (ہنستی ہے)

راجکمار:۔ کیوں ہنس رہی ہو؟

راجکماری:۔ ایک بات ہے۔

راجکمار:۔ بتاؤ نا!

راجکماری:۔ نہیں!

راجکمار:۔ کیوں؟

راجکماری:۔ یہ اپنے من کی بات ہے۔

راجکمار:۔ ایک من کی بات ہم بتائیں گے۔ ایک من کی بات تم بتاؤ۔

راجکماری:۔ پہلے تم بتاؤ۔

راجکمار:۔ نہیں پہلے تم بتاؤ۔

راجکماری:۔ اچھا مجھے چھوڑو۔ تو۔ ہاں بات یہ ہے کہ جب میں پیدا ہوئی تو ایک پری نے مجھے یہ آسیس دی کہ میں بڑی ہو کر بہت خوبصورت نکلوں گی۔

راجکمار:۔ اُس نے بالکل سچ کہا تھا۔

راجکماری:۔ لیکن دوسری نے میرا ماتھا چوم کر کہا۔ بھولی بھالی لڑکی، سہاگ کی انوکھی رات، نہ کوئی جانے، نہ کوئی بوجھے، ایک انوکھی بات۔

راجکمار:۔ اس کا کیا مطلب؟

راجکماری:۔ سنو تو، اس وقت، کوئی اس کا مطلب نہ سمجھا سکا۔ اب ہوا یہ کہ میں بڑی ہونے لگی اور بڑی ہو کر میری صورت اچھی ہونے کے بجائے بُری ہوتی گئی۔ میرا مطلب ہے، کہ کوئی خاص بات نہ تھی خوبصورتی کی مجھ میں۔ بس یونہی جیسے عام لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سوچتی تھی یہ کیا ماجرا ہے۔ ایک دن جب میں دس برس کی ہوئی تو جنگل میں مجھے وہی دوسری پری مل گئی۔ میں نے اس سے پوچھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ

درصل میں خوبصورت ہوں، بہت خوبصورت ہوں. لیکن میری خوبصورتی کو شادی
کے دن سے پہلے کوئی نہ دیکھ سکے گا. کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ میری سندریا میرے
اطوار بگاڑ دے. مجھے مغرور، سنگدل اور ظالم بنا دے. وہ مجھے ان تمام باتوں سے
بچانا چاہتی تھی اسی لئے تو اُس نے یہ ترکیب نکالی اب اس دن سے یہ حالت
ہے کہ لوگ مجھے بدصورت سمجھتے ہیں. لیکن میرا آئینہ مجھے خوبصورت بتاتا ہے اور
اس بات سے مجھے لطف حاصل ہوتا ہے. اچھا اب تم مجھے اپنے من کی بات بتاؤ.

راجکمار:۔ میری بات اسقدر دلچسپ نہیں، وہ بات صرف اتنی ہے کہ راج کمار اودے سنگھ نے
کہیں سے سُن رکھا تھا کہ درشن دیپ کی راجکماری چندرا بیحد خوبصورت، مغرور اور
تنگ مزاج ہے اور وہ بیچارہ ذرا معمولی شکل و شباہت رکھتا ہے. اُس نے سوچا
کہ وہ اپنے نوکر پانچو کو شادی کے وقت تک راجکمار بنا دیگا، اور وہی راجکماری
چندرا سے پہلی ملاقات کرے گا. لیکن لگن کے وقت پھر راجکمار اودے سنگھ اپنی
اصلی جگہ پر آ جائے گا اور......

راجکماری:۔ وہ کیسے؟

راجکمار:۔ راجکمار اودے سنگھ زرہ بکتر پہن کر بیاہ کرلے گا. زرہ بکتر میں سے تو مُنہ
دکھائی نہیں دیتا.

راجکماری:۔ (ہنستی ہے) کیا مزے کی بات ہے. بالکل گھونگھٹ کی طرح دلچسپ.

راجکمار:۔ ہے نا! (ہنستا ہے) مگر اتنی بھی تو نہیں ——— آخر یہ تم کیوں برابر ہنسے جارہی
ہو ———؟

راجکماری:۔ یہ ایک من کی بات ہے.

راجکمار:۔ ایک من کی بات ہم اور بھی بتا سکتے ہیں.

راجکماری:۔ بتاؤ نا!

راجکمار:۔ پہلے تم بتاؤ۔

راجکماری:۔ نہیں، پہلے تم۔

راجکمار:۔ اچھا تو سنو، میرا نام پانچو نہیں ہے۔ میں سنگلدیپ کا یوراج راجکمار شری اودے سنگھ ہوں۔ (بڑے وقار انداز میں رعب ڈالنے کی کوشش میں مرمر کی چوکی سے ٹکرا جاتا ہے۔) اوہ۔ مر گیا..... ہائے!

راجکمار:۔ گھٹنے میں چوٹ لگ گئی۔ میں راجکمار اودے سنگھ ہوں۔

راجکماری:۔ لاؤ میں گھٹنا داب دوں۔

راجکمار:۔ نہیں۔ میں راجکمار اودے سنگھ ہوں۔

راجکماری:۔ اب کیا حال ہے؟

راجکمار:۔ میں راجکمار اودے سنگھ ہوں۔

راجکماری:۔ مجھے معلوم ہے!

راجکمار:۔ تمہیں کس نے بتایا۔

راجکماری:۔ ابھی تم نے خود ہی تو بتایا ہے۔

راجکمار:۔ آں، ہاں، لیکن تمہیں یہ سنکر کچھ بے ہوش وہوش ہو جانا چاہیئے تھا نا۔ میں نے اکثر کہانیوں میں ایسا پڑھا ہے۔

راجکماری:۔ میں کہانیوں کی لڑکی نہیں ہوں راجکمار۔ اور اب میں تمہیں اپنے من کی بات بتاؤں۔ (دور سے شور سنائی دیتا ہے)

وقفہ

راجکماری:۔ وہ دیکھو لوگ راجکمار کے استقبال کے لئے جا رہے ہیں۔

راجکمار:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خندق کا پل رکھ دیا ہوگا۔

راجکماری:۔ کبھی کا۔ اب میرا خیال ہے کہ تمہارا نوکر پانچو میری نوکرانی چھبیرا سے عشق لڑا رہا

ہو گا ——!

راجکمار:۔ کیا تم ——؟

راجکماری:۔ ہاں مَیں راجکماری چندرا ہوں، جس وجہ سے تم مجھ سے پہلے نہ ملنا چاہتے تھے، اسی بات سے میں بھی ڈرتی تھی۔

راجکمار:۔ مگر راجکماری۔ تم تو۔ بیحد خوبصورت ہو۔

راجکماری:۔ ہاں راجکمار، مجھے دوسری پری نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمام دُنیا مجھے بدصورت کہیگی لیکن وہ آدمی جو مجھے پہلی بار ہی خوبصورت جان لیگا، مجھ سے شادی کریگا۔ اور پھر اسکے بعد میں ساری دنیا کو خوبصورت دکھائی دینے لگوں گی۔

راجکمار:۔ چندرا۔ (طربیہ موسیقی پر فیڈ آؤٹ)

(فیڈ اِن۔ مہاراجہ کا دربار)

وزیر:۔ اب میں سرکار والامدار مہاراج ادھیراج والیِ درشن دیپ شری اگر سین گنی ہو تری کی اجازت سے راجکمار شری اودے سنگھ مہاراج یوراج سنگلدیپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

مہارانی:۔ کیا اب کوئی قسم سے اندیشہ تو نہیں؟

مہاراج:۔ (بلند سرگوشی میں) مطلق نہیں۔ میں نے اُسے اس سوال کا حل بتا دیا ہے "کتّا"! اب وہ بھول نہیں سکتا کیوں اودے سنگھ بھولو گے تو نہیں "کتّا" یاد رکھنا۔

پانچو:۔ جی اچھا کتّا، کتّا، کتّا۔

(بلند سرگوشی میں یاد کر رہا ہے)

مہاراج:۔ (بلند آواز میں) وزیر اعلیٰ! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ راجکمار اودے سنگھ سے وہ آخری سوال بھی پوچھ لو۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میری سلطنت میں ہر کام دستور، انتظام کے مطابق عدل و انصاف سے پورا کیا جائے۔ میں اِنہی رعایا کا خادم ہوں۔

وزیر:۔ سلطنت سنگدیپ کے دستوری نظام کی دفعہ (۹) کے مطابق کوئی راجکمار اس
وقت تک راجکماری سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ اس سوال کا صحیح
جواب نہ دے سکے ـــــ آخری بار ایک راجکمار اس سوال کا ٹھیک جواب
دینے سے قاصر رہا تھا اور وہ راجکماری سے شادی نہ کر سکا۔

مہاراج:۔ اور دوسرے دن اُس کی لاش خندق میں پائی گئی۔

وزیر۔ راجکمار اودے سنگھ تم اس آخری مرحلے کو طے کرنے کے لئے تیار رہو۔

پانچو:۔ مَیں تیار ہوں۔ کتا۔ کتا۔ کتا۔ کتا۔ کتّا۔ (بلند سرگوشی میں، پہلے سے زیادہ بلند)

وزیر:۔ اچھا تو وہ سوال مَیں اب تم سے کرتا ہوں۔ بتاؤ۔ وہ کونسی چیز ہے جس کی چار ٹانگیں
ہوتی ہیں اور ایک کتّے کی طرح بھونکتی ہے؟

پانچو:۔ (رُک کر) "بلّی"

مہاراج:۔ شاباش! شاباش!

(شور مچتا ہے۔ مبارک باد۔ بدھائی ہو مہاراج)

(بدھائی اور مبارک باد کی آوازیں، شہنائی کے سُر بلند ہوتے ہیں۔)

(پھر فیڈ آوٹ)

(وقفہ۔ فیڈ اِن)

مہاراج:۔ ہاں مہارانی۔ اب تمہیں ہمیں، ہم سب کو بدھائی ہو، آخر یہ مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح
طے ہو گیا۔ اور جیسا کہ دیوتاؤں نے کہا ہے شادی سے لڑکی کو شوہر ملتا ہے، ساس کو
داماد، اور سسر کو بیٹا۔ مہارانی یہ راجکمار تمہیں کیسا لگا؟

مہارانی:۔ بُدھو!

مہاراج:۔ میرا مطلب ہے کہ جب وہ پھیرا دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو کتنے سندر دکھائی
دیتے تھے۔

مہارانی :۔ مجھے تو راجکمار بالکل گنوار معلوم ہوتا ہے۔

مہاراج :۔ میں عقل کی بات نہیں کرتا۔ خوبصورتی کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہش چندرا آرہی ہے (وقفہ) چندرا، پیاری بیٹی۔ تو نے راجکمار دیکھا؟ تجھے راجکمار پسند ہے نا؟ (وقفہ)

شرما رہی ہے میری بیٹی ـــــ کس قدر خوش ہے باؤلی۔

مہارانی :۔ اچھا جا بھاگ اب، ابھی تو بڑی دیر میں لگن کے کپڑے پہننا ہوں گے۔

راجکماری :۔ بہت اچھا ماتا جی!

مہاراج :۔ تم نے کچھ دیکھا، مہارانی! (شہنائی کی آواز شروع)

مہارانی :۔ کیا؟

مہاراج :۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے راجکماری اب بدصورت نہیں رہی ہے پہلے کی طرح، بلکہ بہت ہی سندر اور پیاری بن گئی ہے، دن کے سورج کی طرح روشن، رات کی شبنم کی طرح پاک۔

مہارانی :۔ اونہہ، کچھ نہیں۔ یہ صرف شادی کی خوشی ہے۔

(شہنائی آرکسٹرا کے سر عروج پر پہونچکر تھرتھرا کر خاموش ہو جاتے ہیں)

(ماخوذ از "اگلی ڈکلنگ")

ننگا رہنے پر

پرسوں بیکاروں کے کلب میں ایک چیک جنٹلمین سے ملاقات ہو گئی۔ یہ چیک عریانیت کی تحریک کا حامی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جیسا کہ عریانیت پسندوں کا عام قاعدہ ہے ایک عمدہ بریڈ فورٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور منہ میں ایک قیمتی سگار دبا رکھا تھا۔ عریانیت کے اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے کہنے لگا۔ خوبصورتی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک خوبصورتی وہ ہے جو خدا پیدا کرتا ہے اور دوسری وہ جو درزی عطا کرتا ہے۔ انسان کا ناشکرا پن دیکھو کہ حسنِ خداداد کو چھوڑ کر درزی کی مصنوعی خوبصورتی کا سہارا تلاش کرتا ہے۔

چیک جنٹلمین دیر تک عریانیت کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ پچھلے چند ہفتوں سے عریانیت پسندوں کے متعلق کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اور اس دلچسپ تحریک کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ اس ملاقات سے رہی سہی کسر پوری ہو گئی اور میں عریانیت پر ایمان لے آیا۔ اسے ایک روحانی انقلاب سمجھئے جسمانی نہیں۔ کیونکہ جسم تو ایک فروعی ناپائیدار سی شے ہے۔ اصل چیز تو روح ہے اور وہ بھی ایک ہندوستانی کی روح۔

لیکن میرے اکثر احباب جن کا نفسیاتی ماحول قرونِ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکا میرے اس نئے عقیدے کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اکثر پوچھ لیتے ہیں "کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے۔ یہ سوال کرتے وقت اوّل تو وہ یہ دیکھتے ہی نہیں کہ مَیں کپڑے کیوں پہنے ہوئے ہوں۔ اور اگر خود کپڑے پہنتا ہوں تو دوسروں کو کپڑے اُتارنے کی تلقین کرتا ہوں، کیا اس میں میری شریر طبیعت کو کوئی دخل ہے۔ لیکن بحث کے شوق نے اکثر احباب کو اس قدر اندھا کر دیا ہوتا ہے کہ وہ میرے جسم پر کپڑے نہیں دیکھ سکتے اور مجھے عریانیت کی حمایت کرتے ہوئے دیکھ کر فوراً سوال کر دیتے ہیں۔ کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے؟۔

اور مَیں اپنی سیاہ شیروانی ...... میرے پاس ایک ہی ہے۔ دو موقعوں پر استعمال کرتا ہوں۔ (۱) مشاعرے میں نظم پڑھتے وقت۔ (۲) مفت سینما دیکھتے وقت۔ میں اپنی سیاہ شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیتا ہوں "جی .... میں تو ننگا رہنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا۔" "ارے"! وہ چلا کر کہتے ہیں "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ——"

"جی ہاں آپ بلاشبہ غلطی پر ہیں۔" میں دل جمعی سے جواب دیتا ہوں۔ "مَیں نے نہیں کہا کہ میں ننگا رہنے میں کوئی فائدہ دیکھتا ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں ننگا رہنے والوں کی حمایت ضرور کرتا ہوں۔"

"تو پھر" آپ گھبرا کر پوچھتے ہیں "آپ کا منشا کیا ہے میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔" "کیسے سمجھ سکو گے؟" میں جواب دیتا ہوں "ذرا سوچئے تو سہی۔ آپ لوگ اس مہاجنی دور کے پرستار ہیں۔ آپ کے دل و دماغ پر اسی چیز کا تسلّط ہے۔ مہاجنی نظام کی بنیاد فائدہ ہے۔ اگر کسی چیز میں فائدہ ہے تو وہ اچھی ورنہ بُری۔ اگر صنعت چلائی

جاتی ہے تو فائدے کے لئے خیرات کی جاتی ہے تو وہ بھی فائدے کے لئے۔ ہمارا نام ہوگا۔ اخباروں میں شہرت ہوگی۔ ہماری ساکھ بنے گی۔ ساکھ کے ساتھ تجارت اور تجارت سے فائدہ۔ بس یہاں ہر چیز کی کسوٹی فائدہ ہے۔ آپ یقین مانیئے عریانیت پسندوں کے کامیاب ہوجانے پر حکومت سب سے پہلے جو کام کرے گی وہ یہ ہے کہ اس لفظ "فائدہ" لغت سے خارج کر دے گی۔ حیرت ہے کہ ہم لوگ ہر چیز کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس میں فائدہ ہے! کوئی فائدہ ہے؟ کتنا فائدہ ہے؟ کس کا فائدہ ہے؟ کیوں کر فائدہ ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس فائدے کے چکّر میں پڑ کر خوشی کو گنوا بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ آخر خوش رہنے میں فائدہ ہی کیا ہے۔ مسرّت ایک بے فائدہ اور بے اختیاری سا جذبہ ہے اور مہاجنی کے اندھے چکّر میں پڑ کر ہم یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ دنیا میں ایسی کتنی ہی بے فائدہ چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کا جزو عظیم ہیں۔ اور آخر ان بے فائدہ باتوں کے سوچنے سے کیا حاصل۔ یہی وقت اگر کوک شاستر بیچنے یا نفیس نفیس ریشمی ساڑھیاں فروخت کرنے پر صرف کیا جائے تو کتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ بیشک بیشک آپ فائدہ حاصل کیجئے۔ یونہی ننگا رہنے کی بے فائدہ تحریک پر بے فائدہ بحث کرنے سے کیا فائدہ......؟"

اور میرے دوست غصّے میں آکر کہتے ہیں: "آپ نے تو یونہی اس فائدے کے لفظ سے کھینچا تانی شروع کر دی۔ ہم نے تو یونہی سرسری طور پر پوچھا تھا کہ آخر ہم ننگے کیوں رہیں؟"

اور میں اپنے دوست سے پوچھتا ہوں کہ آخر ہم ننگے کیوں نہ رہیں اور مجھ سے اگر صاف صاف پوچھتے ہو تو اس تحریک سے میری ہمدردی کا باعث وہ نفرت اور غصّہ ہے جو مجھے اپنے درزی کے خلاف ہے۔ میں ننگا رہنا اس لئے پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے درزی کا بل ادا کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں۔ گو مجھے اس امر کا بھی احساس

ہے کہ اسے ہمیں انسان بنانے میں کافی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ذرا میری اس سیاہ شیروانی کی طرف دیکھئے کتنی اچھی سلی ہے۔ اگر میں اسے نہ پہنے ہوئے ہوں تو مجھے کون انسان کہے گا۔ اور کون مجھے مشاعرے میں گھسنے دے گا۔ دراصل آپ لوگ بات کی تہ تک نہیں پہنچے یا شاید پہونچنا ہی نہیں چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غیر شعوری اضطراری خوف آپ کو ہر وقت دبائے رکھتا ہے، آپ کے دل و دماغ پر ہر وقت مسلط رہتا ہے۔ اور وہ خوف یہ ہے کہ مبادا آپ کو کوئی حیوان کہدے۔ دوسرے دوپایوں یا چوپایوں کی طرح آپ بھی ننگے ہی پیدا ہوئے، مدتوں ننگے رہے، پھر کھیل ہی کھیل میں درختوں کی چھال اوڑھ لی۔ جس طرح جنگل کے بندروں نے ایک بار کھیل ہی کھیل میں غریب سوداگر کی ٹوپیاں لوٹ کر اپنے سروں پر رکھ لی تھیں۔ اور آج یہ حالت ہے کہ پاؤں کے ٹخنوں تک کو جرابوں میں چھپا دیا ہے۔ مبادا انہیں ننگا دیکھکر کوئی جانور کہہ دے اور حقیقت پر سے نقاب اُٹھ جائے۔ بس یہی خوف و ہراس ہر وقت آپ کی روحوں کو اسیر اور آپ کے جسموں کو کپڑوں کا غلام بنائے رکھتا ہے۔ غریب ڈارون کی مخالفت بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے اور ننگا رہنے والوں پر جو پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ اُن کی اساس بھی یہی خوف ہے، ہائیں! کیا ہم جانور ہیں؟ کیا ہم حیوان ہیں؟ کیا ہم بندر کی ارتقائی منزل ہیں؟

مجھے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے انکار نہیں۔ لیکن میں اسے غلط سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کپڑے نہ پہنیں تو اشرف المخلوقات نہیں رہیں گے۔ انسان اور حیوان میں جہاں بہت قریب کا تعلق ہے وہاں بہت سی باتوں میں فرق بھی ہے لیکن یہ فرق کپڑے نہیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہمارے مغربی بھائی بھی شامل ہیں۔ یہاں مجھے اُن میم صاحب کی مذبوحی حرکات یاد آتی ہیں، جو اپنے کتوں، بلیوں اور میناؤں کو کوٹ، فراک اور کانوں میں بالیاں پہنا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ یہ عام کتے، بلیاں اور مینائیں نہیں بلکہ اُن سے الگ تھلگ اور انسانوں سے ملتی

جتنی کوئی دوسری نسل ہو۔ اور آج کل تو ان کپڑوں کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر شخص اعلیٰ سے اعلیٰ اور مکلف سے مکلف لباس پہن کر گویا انسانیت کی معراج تک پہنچنا چاہتا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز حالت ہے۔ یہ صریح دھوکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر میں گاڑھے کا تہمد باندھ کر بازار سودا مفت لینے جاؤں تو مجھے کوئی دو پیسے کا اُدھار دینے کا روادار نہیں۔ لیکن اگر "فوق البھڑک" کپڑے پہن کر نکلوں تو دوکاندار خوشی سے بیسیوں روپیہ کا اُدھار کر لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی مشاعرے میں ننگا چلا جاؤں تو خبطی اور سودائی سمجھ کر ہال سے باہر نکال دیا جاؤں گا۔ لیکن اگر یہی سیاہ شیروانی زیب تن ہو تو پھر دیکھئے مشاعرے کے منتظم کس طرح جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ آئیے صاحب، آئیے ادھر تشریف لائیے۔ آگے آئیے۔ اس کرسی پر بیٹھئے۔ وہ وہ خاطریں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یا اللہ، شاعر میں ہوں یا میری شیروانی۔

بعض سیدھے سادے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کپڑے انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں میں وہ نہیں دُہرانا چاہتا جس کا مطلب یہ ہے کہ "چاند گہنوں کے بغیر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے"۔ لیکن میں یہ بات ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان سیدھے سادے لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ کپڑے دراصل اس لئے پہنے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی بدصورتی کو چھپا سکیں۔ جس طرح روحانی بدصورتی کو لوگ خیرات سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح جسمانی بدصورتی کو چھپانے کے لئے خوشنما پوشاکیں پہنی جاتی ہیں "فوق البھڑک" اچکنیں اور ساڑھیاں پہنی جاتی ہیں تاکہ بیمار جسم کی بیمار جلد پر نگاہ نہ پڑسکے چہرے پر غازہ، تاکہ رخساروں کی زردی ڈھک جائے۔ لبوں پر سرخی، تاکہ بیمار خشک اور روکھے لب کسی کو متنفر نہ کر دیں۔ یہ کپڑے تو دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ اگر آپ لوگ واقعی صحت ور ہیں اور خوبصورت جسموں کے مالک ہیں۔ تو اس کو چھ چھ گز لمبی ساڑھیوں یا اچکنوں میں چھپانے سے کیا حاصل۔ گلاب کی رعنائی یا دلکشی اس میں ہے کہ وہ آپ کی آنکھوں

کے سامنے ہنستا رہے اور اپنے حسنِ خداداد کے جلووں سے اس دنیا کو روشن کرتا رہے۔ گلاب کی کلی، چنبیلی کا پھول۔ آسمان کی نیلاہٹ، شفق کا حسن، اگر ان تمام چیزوں کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تو کیا صرف انسانی حسن کو کپڑوں کی حاجت ہے۔ کیا وہ سچ مچ اس قدر گندہ، بوسیدہ اور مفلوک الحال ہو چکا ہے کہ اُسے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے کپڑوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

میں کئی ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں، جو یوں تو عُریانیت کے پرستار نظر آتے ہیں، لیکن باطن میں عُریانیت سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور اکثر چپکے چپکے ان لفظوں میں اپنی کمزوری کا اقبال کر لیتے ہیں: "بھئی عُریانیت ہے تو اچھی چیز۔ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی ہے" اور یہ شرم بالکل ٹھیک ہے اور حالات کے مطابق۔ کیونکہ انسان کی سرشت میں بدی اب اتنا گھر کر چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عُریاں دیکھنا مطلق پسند نہیں کرتا۔ چوری کرتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی، دھوکا دیتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن کپڑے اُتارنے پر ضرور شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور شاید یہ بھی سچ۔ کیوں کہ اب انسانی شرم کے لئے کپڑوں کے سوا اور کونسی جگہ رہ گئی ہے جہاں اُسے پناہ دی جاسکے۔ بزرگوں سے سُنا کرتے تھے کہ انسان کی شرم اس کے دل میں اُس کی آنکھوں میں رہتی ہے۔ اب لے دیکے صرف کپڑوں میں رہ گئی ہے، اور پھر اگر یہ کپڑے بھی اُتار لئے گئے تو وہ اُسے کہاں رکھے گا۔ شاید موقع پا کر سستے بھاؤ بیچ دے۔ آخر مہاجنی دَور ٹھیرا، آجکل کے فلسفۂ عریانیت میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ہے اس کی ٹھوس، بنیادی سچائی۔ اس امر سے انکار ہو سکتا ہے کہ خدا نے ہم سب کو ننگا پیدا کیا۔ لیکن ہم لوگ اپنے عُریاں حسن سے آہستہ آہستہ متنفر ہوتے گئے اور اُسے کپڑوں میں چھپانے لگے۔ گیہوں، شیطان یا حوا نے انسان کو اتنا گمراہ نہیں کیا جتنا کپڑوں نے۔ کپڑے انسانی صعوبتوں کا منبع ہیں! اگر انسان

کپڑے پہننا چھوڑ دے تو دُنیا میں آج آشتی اور مساوات کا دور دورہ ہو جائے۔ بنی نوع انسان کی سب تکالیف دور ہو جائیں۔ نہ جنگیں ہوں نہ چھوت کی بیماریاں نہ درزی۔ بس ہر طرف چین ہی چین ہو۔ اسمبلی کے اراکین پارلیمنٹ میں موت کی شعاعوں پر بحث کرنے کی بجائے الٹرا وائیلٹ شعاعوں پر غور کیا کریں گے۔ انڈین نیشنل کانگریس سوراج سوراج کا پکارنا چھوڑ دے گی۔ کیونکہ اس وقت ہر شخص (خارجی طور پر ہی) چھوٹا موٹا مہاتما گاندھی بن چکا ہو گا۔ ہندوستان کے "ننگے کروڑوں آدمیوں" کا سوال سوال نہ ہو گا۔ بلکہ ایک حل یعنی ایک ایسی طے شدہ بات جس پر مزید غور کی ضرورت نہ ہو گی۔

اب اس خوبصورت تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ کہنے کو تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ دُنیا میں عریانیت پسند اقلیت میں ہیں۔ اُنہیں نہ صرف درزیوں کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان تمام جماعتوں کا بھی جو ابھی کپڑے پہنتی ہیں اور سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، نہاتے دھوتے عشق کرتے۔ غرضیکہ ہر وقت فیشن کے مطابق کپڑوں میں ملبوس رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو بظاہر نیم برہنہ حالت میں رہتے ہیں۔ لیکن ہر لمحہ کپڑوں کی آرزو میں جیتے ہیں۔ یہ اوسط درجے کے نیم برہنہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ انہیں تحریک عریانی کا حامی نہیں دشمن سمجھنا چاہیئے۔ عریانیت پسندوں کو ان تمام منظم و مقتدر جماعتوں کے خلاف جنگ کرنا ہے اور کپڑوں کے ظلم سے دُنیا کو نجات دلانا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس دُنیا میں سچے اشتراکی صرف ننگے رہنے والوں کی جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ نازیوں سے پہلے جرمنی میں اشتراکیت اور عریانیت کی تحریکیں بہت زوروں پر تھیں۔ ہٹلر نے آتے ہی موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور دونوں تحریکوں کو فوراً دبا دیا۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے جو ہٹلر نے کیا یعنی اشتراکیت اور عریانیت کو ایک ہی تحریک سمجھنا چاہیئے۔

ہمارے جنت نشان میں عریانیت کی تحریک بہت پرانی ہے اور صدیوں سے

چلی آتی ہی۔ ہندوستان میں کروڑوں آدمی ننگے رہتے ہیں۔ لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں سارے کنبے میں عورتوں کے پاس صرف ایک دھوتی ہی دھوتی ہے۔ جسے وہ باری باری گھر کے کام کاج کرنے کے استعمال میں لاتی ہیں۔ مرد، عورتیں، بچّے عادتاً ضرورتاً ننگے رہتے ہیں اور ساری عمر اس چمڑی میں گزار دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کی وجہ نہ ان کی غربت ہی نہ انگریزی راج کی برکت۔ بلکہ محض قانونِ قدرت۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے جس نے ہزارہا سال سے عریانیت کی شمع کو اپنے علم و فضل سے فروزاں کر رکھا ہے میرا اشارہ ناگوں کی طرف ہے۔ ناگے وہ بہادر، بے غرض اور فقیر لوگ ہیں جو اکثر کنبھ کے میلے پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی پاکیزہ روایات اور بے مثل قربانی سے ہندوستان میں عریانیت کی تحریک کو اسکی تمام سچائی اور خوبصورتی کے ساتھ زندہ رکھا ہی۔ جب تک ان لوگوں کا دم باقی ہی اس تحریک کے مٹ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہی۔ یہ تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں ننگے رہتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ناگوں کی طرح اس تحریک کی بنیادی روحانیت سے واقف نہیں اور شاید یہ لوگ ہر لحظہ یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ انہیں اور کپڑے ملیں تو یہ اپنے بال بچّوں اور بیویوں کے جسموں کو کپڑوں سے ڈھک سکیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت خطرناک طور پر رجعتی اور بورژوائی ہی۔ ضرورت اس امر کی نہیں کہ ان لوگوں کو کپڑے مہیا کئے جائیں۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں کپڑوں کے مضر تاثرات سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے لئے لگاتار پروپگنڈے کی ضرورت ہے۔

مقام شکر ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں کی توجّہ اب اس طرف منعطف ہوتی جاتی ہی۔ پچھلے دنوں مہاراجہ آف جام نگر (مرحوم) نے ایک نہایت شاندار سولے ریئم (SOLARIUM) جام نگر میں تعمیر کرایا۔ اسی طرح بمبئی کے لکھ پتیوں نے بھی ننگا رہنے

کا ایک کلب قائم کیا ہی۔ یہ ہے وہ سچی مساوات جسے صرف کوئی ننگا رہنے والا ہی دوبارہ زندہ کرسکتا ہی اور مجھے تو عریانیت کا مستقبل اور اس لئے انسان کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہی۔ اور میں تو باطن کی آنکھ سے وہ زمانہ دیکھ رہا ہوں کہ جب ننگا رہنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ جب اس دُنیا میں ایک ننگا انقلاب آئیگا، ایک برہنہ طوفان جو ہر قسم کے کپڑوں کو (ان میں اونی، سوتی، ریشمی اور جاپانی ہر قسم کے کپڑے شامل ہیں) خس وخاشاک کی طرح بہالے جائیگا۔ اور سب انسان قدرت کے حضور میں ننگے کھڑے ہوں گے اور دُنیا مکمل مساوات، مکمل آزادی، اور مکمل امن حاصل کرے گی۔

یوگا

میں بہت عدیم الفرصت ہوں، اسکی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ مجھے دفتر جانا ہوتا ہے۔ میں نے اب دفتر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا ہے، اب میں صرف ریس کا کام کرتا ہوں، اور گھوڑ دوڑ کے لوگوں کے لگائے ہوئے ٹپ ہی میری معاشی و اقتصادی ضروریات کے کفیل ہو جاتے ہیں۔ ریس میں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ زیادہ عقل کی بھی ضرورت نہیں (اسی لئے تو میں ریس کھیلتا ہوں) بس ریس میں یہ چاہیئے کہ آنکھ بند کر کے تجاکی کے ٹپ پر روپیہ لگا دیا جائے۔ تھوڑی دیر میں روپیہ مینہ کی طرح برسنے لگتا ہے۔ میں سال میں صرف تین ماہ ریس کھیلتا ہوں اور اتنا روپیہ کما لیتا ہوں کہ یہ رقم نہ صرف اس سال کیلئے بلکہ اگلے دو سالوں کیلئے بھی کافی ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر ہمیشہ ریس میں اسی طرح جیتتا رہا تو اپنی زندگی کے آخر میں اگلی دو زندگیوں کے آرام و آسائش کا سامان بھی بہم پہنچا لوں گا۔ عجیب شے ہے یہ ریس بھی! اس میں لگایا ہوا روپیہ پشتہا پشت کام دیتا ہے!

ہاں تو میں اپنی عدیم الفرصتی کا ذکر کر رہا تھا، یوں دیکھا جائے تو مجھے بظاہر تین ماہ کی

ریس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں، وقت وافر ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے کٹتا نظر آتا ہے لیکن بھلا ہو میری بری صحت کا کہ مجھے ان دنوں کوئی نہ کوئی بیماری ضرور لاحق ہو جاتی ہے۔ دراصل میری عدیم الفرصتی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں اکثر کیا عموماً بیمار رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اپنے آپ کو ہمیشہ بیمار پایا ہے۔ یہ بیماری کبھی دم نہیں لینے دیتی۔ اس سے کبھی فرصت حاصل نہیں ہوتی۔ اگر فرصت ملتی تو خدا گواہ ہے کہ میں دنیا میں ضرور کوئی بڑا کام کرتا۔ سرکس کھولتا۔ اینٹوں کا بھٹا بناتا۔ بینک کھڑا کرتا، غریب بیواؤں کے زیور گروی رکھتا، بنگال کے قحط زدگان کے لیے ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کرتا اور پھر اس رقم میں سے دس ہزار روپیہ قحط زدگان کی مدد کے لیے بھیج بھی دیتا۔ الغرض کوئی ایک ایسا بڑا کام ضرور کرتا جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی کی نظروں میں بڑا آدمی بنا دیتا ہے!

لیکن برا ہو بیماری کا کہ اس نے کہیں کا نہ رکھا۔ اور کوئی ایک بیماری ہو تو بتاؤں، جب پیدا ہوئے تو تین ماہ بعد ہی اس زور سے چیچک نکلی کہ چہرہ شہد کی مکھیوں کا خالی چھتہ بن گیا۔ پھر جوں جوں بڑے ہوتے گئے بیماریاں بھی بڑھتی گئیں۔ خسرہ، نمونیا، ٹائیفائڈ، یرقان، عشق، اختلاج قلب، ملیریا، درد جگر، جوڑوں کا تاپ، کالی کھانسی، سفید کھانسی، پیلی کھانسی، خونی کھانسی، قوس و قزحی کھانسی، ہر رنگ کی کھانسی ہوئی، جو آنکھیں دکھنے پر آئیں نہ صرف آنکھیں دکھنے لگیں، بلکہ ہاتھ، پاؤں، دل، جگر، سینہ سب دکھنے لگے، جب پاؤں میں آبلے پڑے تو کلیجے میں بھی چھالے پڑ گئے اور جگر میں تو ناسور تک ہو گئے۔ پریشان کر دیا اس بیماری نے! یہ کمبخت کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ آخر جب میں اس بیماری کے ہاتھوں بالکل عاجز آ گیا۔ اور جب ماں کی گھٹیوں اور محلے والیوں کی جڑی بوٹیوں سے کچھ افاقہ ہوا تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ یہ ایک ایلو پیتھک ڈاکٹر تھا۔

اس ڈاکٹر نے پہلے میری نبض دیکھی، پھر زبان، پھر پیشاب، پھر خون، پھر آنکھیں، پھر سینہ، پھر بلغم، اور پھر میرے والد سے کہا: اس لڑکے کو برسوں پھر لاؤ۔ جب تک میں خوردبین

سے سب بیماری دیکھ لوں گا۔

اُس روز جب ہم وقت مقررہ پر پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف پیشاب میں کیلسیم آتا ہے۔

"کیلسیم کیا ہوتا ہے؟" میرے والد نے پوچھا۔

"چونا!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"لاحول ولا" میرے والد نے جواب دیا۔ "ریل کے انجن اور ہوائی جہاز کے زمانے میں کیسی کیسی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ چونا؟" پھر میرا کان مروڑ کر بولے "کیوں بے! کیا تو دن بھر چونا کھاتا رہتا ہے؟ خبردار جو آئندہ سے تو نے پاندان کو ہاتھ بھی لگایا۔"

لیکن پان نہ کھانے پر بھی بیماری میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بعد میں جب بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ مجھے ایک دم بہت سی بیماریاں لاحق ہو گئی ہیں۔ پیشاب میں کیلسیم آتا ہے تو خون میں لوہا، سانس میں کاربن، آنسو میں نمک، بلغم میں سوڈا ہے تو سینے میں گندھک۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا عالمِ جمادات میرے جسم میں آکر اکٹھا ہو گیا ہے اور دنیا کا طاقتور سے طاقتور انجکشن بھی میرے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ ایلوپیتھک ڈاکٹر نے کہ جس کا سب سے بڑا حربہ انجکشن ہے میرے والد کو صاف جواب دیدیا۔ "مجھے افسوس ہے میں آپ کے لڑکے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا!"

میں روتا ہوا کمرے سے واپس نکل آیا۔ میرے والد میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ "نہ رو بیٹا۔ ان آنسوؤں کو سنبھال کر رکھ۔ ان آنسوؤں میں نمک ہے!"

میں نے اپنی صحت کو بہتر بنانے کے لئے اور بیماری سے پیچھا چھڑانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کے پاس گیا اور بائیو کیمسٹری والوں کے پاس جو صرف بارہ دواؤں سے جہان بھر کی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ لیکن ان بارہ دواؤں کے کھانے سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پھر میں نے ویدک اور یونانی دواخانوں کی طرف رجوع

کیا۔ اور ہر اُس جھاڑی کے پتے، پھل، پھول، جڑیں تک کھا ڈالیں جنہیں دیکھتے ہی سے متلی ہو جاتی ہے اور جنھیں انسان تو کیا بھیڑ بکریاں تک بھی سونگھنا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن بیماری نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا، بیماری بھی بڑی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ میں بالکل جوان ہو گیا۔ اب ڈاکٹروں نے پینترہ بدلا۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا۔ یہ لونڈا اس لئے بیمار رہتا ہے کہ ابھی تک اسکی شادی نہیں ہوئی۔ فوراً اس کا بیاہ کر دو!

چنانچہ میری شادی بھی ہو گئی۔

لیکن میری بیوی کے غلبے سے بیماری کا غلبہ کم نہ ہوا۔ پہلے صرف ایک چیز کا غلبہ تھا، اب دو کا۔ بعد میں جب بچے پیدا ہوئے تو ان غلبوں کی تعداد چھ سات تک پہونچ گئی۔ حتیٰ کہ مجھے انشورنس ایجنٹ کے پاس جانا پڑا۔

لیکن انشورنس سے بھی بیماری کم نہ ہوئی۔ البتہ کبھی کبھی مُنہ پر رونق آ جاتی تھی جس سے لوگ سمجھتے تھے کہ مریض کا حال اچھا ہے۔

پھر ایک دن مجھے ایک حکیم نے بتایا کہ مجھے تلّی ہے۔

مَیں اُچھل پڑا۔ تلّی ہے؟ سچ کہتے ہو حکیم صاحب مجھے تلّی ہے؟

”ہاں!“

”اور جگر بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جگر بھی ہے!“ حکیم نے میرے سوال کو اچھی طرح سے نہ سمجھتے ہوئے بھی جواب دیا۔

بعد میں جب میں دوسرے حکیموں کے پاس گیا، تو اُن سے پتہ چلا کہ میرے نہ صرف تلّی ہے، بلکہ جگر بھی ہے، دل ہے۔ دو آنکھیں ہیں، دو بازو ہیں، دو ٹانگیں ہیں، ایک سر ہے، دو کان ہیں۔ غرضکہ جہاں بھر کی بیماریاں میرے جسم میں آ کر اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے جب صورت حالات یہ ہوں تو انسان بیچارہ کیا کرے۔ جنگ نہ کرے تو کیا

کرے۔ کیونکہ انسان کے نہ صرف تلی ہی بلکہ معدہ بھی ہے اور یہ معدہ اُسے ہمیشہ لڑنے پر مجبور کردیتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دُنیا میں سب جنگیں معدے کی وجہ ہی سے ہوتی ہیں اور اگر اینڈے سائی ٹس کی فالتو آنت کی طرح معدے کو بھی آپریشن کرکے انسانی جسم سے خارج کردیا جائے تو انسانوں کے درمیان کبھی جنگ نہ ہو۔ کئی بار مغربی جرّاحوں نے آپریشن کے ذریعے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ ہر بار ناکام ہوئے ہیں۔ کیونکہ انسانی جسم معدے کے بغیر بیکار ہوجاتا ہے اور اسی بیکاری کو موت کہتے ہیں۔ مغربی جراحی اس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اب بہ سانی آدمی کی ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے۔ اور اسے ایک لکڑی کی ٹانگ دیدی جاتی ہے۔ اس لکڑی کی ٹانگ سے آدمی وہی کام لے سکتا ہے، جو اصلی ٹانگ سے۔ اور ابھی حال ہی میں مَیں نے ایک امریکی پرچے میں ایک سپاہی کی تصویر دیکھی تھی جو اپنے شہر میں رقص کے سالانہ مقابلے میں اوّل رہا تھا۔ اس سپاہی کی ٹانگ لکڑی کی تھی۔ یہ سپاہی خوبصورت امریکی دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اور اُسے دیکھ کر میرا جی چاہا کہ مَیں ایک کیا اپنی دونوں ٹانگیں کٹوا کر لکڑی کی ٹانگیں لگوالوں، اور —— خیر جانے دیجئے۔

ٹانگ کے علاوہ اور بہت سے انسانی اعضا مصنوعی تیار کئے جاتے ہیں اور انسانی جسم میں ریڈیو ویلو کی طرح لگا دئے جاتے ہیں۔ اور خوبی یہ کہ انسانی جسم کے افعال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چنانچہ آجکل بیماری کے ذرا سے شبہ پر گردہ نکال لیا جاتا ہے، آنت کاٹ دی جاتی ہے، پھیپھڑا تبدیل کردیا جاتا ہے۔ لارڈ نوفیلڈ کی مہربانی سے آج کل لوہے کے پھیپھڑے بننے لگے ہیں کہ جن کے استعمال سے انسانی تنفس کے دورے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، اور پھر ان مصنوعی اعضا میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انسانی نشوونما کے لئے انسانی خون اور خوراک کی ضرورت نہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عملِ جرّاحی میں ابھی یہ خوبی نہیں پیدا ہوئی کہ

وہ ایک ایسا معدہ ایجاد کر سکے جو کھانا نہ طلب کرے۔ میں نے بڑے بڑے مغربی جراحوں سے نہایت صراحت کے ساتھ پوچھا کہ مجھے کیا بیماری ہے۔

سب کی ایک ہی رائے ہے۔ مجھے معدے کی بیماری ہے۔

لیکن یہ کیا بیماری ہے۔

تمہارے معدے کو بھوک لگتی ہے۔

پھر کیا کیا جائے۔ میں نے ملتجیانہ انداز میں اُن سے کہا۔ کیا کہیں سے کوئی ایسا معدہ نہیں تیار ہو سکتا جسے بالکل بھوک نہ لگے۔ لوہے کے پھیپھڑے یا لکڑی کی ٹانگ کی طرح۔

جرّاحوں نے انکار میں سر ہلا دیا اور میں آپریشن روم سے باہر چلا آیا۔

اس کے بعد میں نے ڈونگرے کا بال امرت سے لیکر امرت دھارا تک سب پیٹنٹ ادویہ آزما کر دیکھ لیں۔ مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بیسیوں فقیروں کے منتر جنتر، تعویذ، گنڈے بھی پرکھ لئے، بیماری جوں کی توں رہی، سنیاسیوں اور کایا کلپ والوں کے پاس گیا۔ اور شنگرف کے کشتے سے لے کر اکسیر سنکھیا تک کھا ڈالی۔ لیکن نہ موت آئی، نہ بیماری ٹلی۔ ایک پڑھے لکھے آدمی نے جو تازہ تازہ ولایت سے آیا تھا۔ اور ابھی تک چھری کانٹے سے کھانا کھاتا تھا، نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے، یہ ضرور کوئی ذہنی بیماری ہے۔

ذہنی بیماری؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں! ذہنی بیماری۔ تم اپنا علاج کسی ماہر نفسیات سے کراؤ۔

وہ کون بلا ہے؟

ماہر علم نفسیات! ڈاکٹر حمید سے ملو۔ وہ حال ہی میں امریکہ سے یہ علم سیکھ کر آئے ہیں جہاز پر وہ میرے ساتھ تھے۔ یہ لو اُن کا پتہ!

چنانچہ میں ڈاکٹر حمید کے ہاں پہنچا۔ ڈاکٹر حمید نے کہا۔ میں جو کچھ پوچھوں صاف صاف کہتے جائیے۔ فوراً کہتے جائیے۔

سوچے بغیر میں نے کہا۔ بہت اچھا۔

ڈاکٹر حمید نے پوچھا۔ آپ کا نام!

میں نے کہا جگتی لال۔

باپ کا نام؟

بھگتی لال۔

دادا کا نام؟

ٹھگتی لال۔

پردادا کا نام؟

الّو کی دُم فاختہ۔ میں نے جواب دیا۔

ہُم۔ ڈاکٹر حمید کسی گہرے سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اُنہوں نے میرا جواب کاغذ کے ایک ورق پر نوٹ کر لیا۔

پھر بولے۔ آپ کتنے بھائی ہیں۔

چار!

کتنی بہنیں؟

کتنی بیویاں ہیں۔

ایک۔ اور اگر آپ نوکرانی کو بھی شامل کر لیں تو دو! میرا مطلب ہے کہ آپ نے صاف صاف جواب ——

میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر نے ورق پر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

اب تیسرا دور شروع ہوا۔ کہنے لگے، اب میں ایک لفظ کہوں گا آپ اُس کے

جواب میں جو آپ کے دل میں آئے، فوراً کہیئے۔

میں نے کہا، بہت اچھا۔ میری جان!

مسکرائے۔ کہنے لگے، ابھی نہیں۔ دیکھیئے۔ پہلے میں ایک لفظ کہتا ہوں، آپ اس کا جواب دیجئے۔

ڈاکٹر حمید کچھ عرصہ خاموشی سے اپنی گھڑی کی طرف تکتے رہے۔ پھر اچانک بولے۔

گدھا!

آلو بخارا۔ میں نے کہا۔

ٹوپی!

پھندنا۔ میں نے جواب دیا۔

رام راجیہ!

چل چل چمیلی باغ میں! میں نے جواب دیا۔ ڈاکٹر حمید نے اُسے فوراً نوٹ کر لیا۔ پھر بولے۔ اب میں ایک لفظ بولوں گا۔ آپ کچھ کہیں گے۔ میں پھر اُسے دُہراؤں گا۔ آپ پھر اس کے جواب میں کچھ کہیں گے۔ میں پھر اُسے دُہراؤنگا، آپ پھر ——

یا اللہ یہ کیسا تماشہ ہے۔

چلیئے، میں نے کہا۔

وہ بولے۔ صابن!

میں نے کہا۔ دھوبن۔

وہ بولے۔ دھوبن۔

میں نے کہا۔ فیڈی واس۔

وہ بولے۔ فیڈی واس۔

میں نے کہا۔ بکواس!

وہ بولے۔ بکواس۔
میں نے کہا چپ!
وہ بولے چُپ۔
میں نے کہا۔ کہہ، کہہ، کہہ، کہہ، یکایک میں طوطے کی آواز نکال کر ہکلانے لگا۔
ہُم! ڈاکٹر حمید نے زور سے میری گدی پر ہاتھ مارا۔ پکڑ لیا آخر، آپ کو ہکلانے کا مرض ہے۔
لیکن ڈاکٹر صاحب میں تو کبھی نہیں ہکلاتا۔
آپ نہ ہکلائیے، اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ مرض آپ کے لاشعور میں ہے!
لاشعور میں؟
ہاں۔ لاشعور کی لہروں میں تیر رہا ہے۔ اور یہ مرض آپ نے ورثہ میں پایا ہے۔ اپنے باپ سے یا اپنی ماں سے۔
لیکن میرے ماں باپ بالکل نہیں ہکلاتے۔ غالباً یہ مرض اُن کے لاشعور میں بھی۔
..... میں نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔
"ہاں ٹھیک ہے۔ وہاں بھی تیر رہا ہے۔ انھوں نے غالباً اپنے ماں باپ سے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔
"میں نے اپنے دادا دادی اور نانا نانی کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہ بالکل صاف رواں بولتے تھے۔ میری طرح!" میں نے کہا۔
آہ۔ آپ لاشعور کی لہروں سے واقف نہیں۔ ہزاروں امراض یہاں تیرتے رہتے ہیں۔
تو پھر یہ مرض کس طرح دفع ہو گا۔ میں نے پوچھا۔
دفع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "لائیے میری فیس" اور انہوں نے ہاتھ

بڑھاپا۔

دفع بھی ہوگیا؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ یہ کیوں کر؟

ڈاکٹر صاحب بولے، یہ علمِ نفسیات کا ایک تحلیلی عملیہ ہے کہ جب کسی مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے اور مریض کو پتہ چل جائے کہ اُسے کیا بیماری لاحق ہے تو وہ مرض اسی دم تحلیل ہو جاتا ہے۔ سمجھے آپ۔ لائیے۔ ساٹھ روپئے۔

اور پھر میں نے اپنے ساٹھ روپیوں کو ڈاکٹر کی میز کی دراز میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھا۔

اور لاشعور کی لہریں فضا میں تیر رہی تھیں۔

علمِ نفسیات کے تحلیلی عملئے نے مجھے دو چار دن جکڑے رکھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ہکلا پن جو مجھے کبھی نہ ہوا تھا، اب دُور ہو گیا تھا۔ اس سے بیمار جسم کو اور کوئی فائدہ نہ پہونچا تھا۔ چنانچہ میں نے پلاسٹک سرجری کے ماہروں سے مشورہ کیا کہ مجھے اس بارے میں کیا کرنا چاہیئے۔ پلاسٹک سرجری آپ جانتے ہیں ان دنوں اپنے عروج کے انتہائی نقطے پر ہے۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کی ناک آتشک کی وجہ سے بیٹھ گئی ہو یا خدا نہ کرے کسی نے آپ کی ناک کاٹ ڈالی ہو تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے سے فوراً نئی ناک لگائی جا سکتی ہے، اگر آپ کے ہونٹ پھٹے ہوئے انجیر کی طرح بدصورت اور بدنما ہیں تو انہیں پلاسٹک سرجری سے گلاب کی پتی کی طرح حسین و جمیل بنایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک گیا ہے تو اُسے چٹکیوں میں یوں غائب کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جنگ عظیم میں تو اس صنف کے ڈاکٹروں نے کمال کر دکھایا ہے۔ یہ لوگ جلی ہوئی انسانی کھال کی جگہ نئی جلد لگا دیتے ہیں۔ نئے کان عطا کرتے ہیں، نئے پپوٹے، نئی آنکھیں، نئی بھویں، سر گنجا ہو تو کھوپری کے اوپر بال بھی لگا دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کھوپری کے اندر دماغ نہ ہو تو وہ بھی ڈال دیتے ہیں! اسی لئے میں نے سوچا کہ پلاسٹک سرجری کے ماہروں سے مشورہ کیا جائے۔

مجھے ایک نیا جسم چاہیئے۔ بالکل نیا جسم۔ میں اس جسم کو تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمیشہ

بیمار رہتا ہے۔
پلاسٹک سرجری کے ماہروں نے کہا "ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کو نیا جسم نہیں عطا کر سکتے۔ ہم تو مرمت کرنے والے موچی ہیں۔ نیا بوٹ نہیں بنا سکتے"

کہتے ہیں جب چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب تاریکی اس قدر مہیب اور خوفناک ہو جاتی ہے تو دل لرزنے لگتا ہے تو اسی تاریکی کے سینے میں خود بخود روشنی کی کرن پھوٹتی ہے اور اندھیرے کو اپنی ضَو سے چکا چوند کر دیتی ہے۔
میری اندھیری زندگی میں یکایک روشنی کی کرن جگمگا اُٹھی۔
ایک یوگی نے میری تاریک قسمت کو روشن کر دیا۔
یوگی نے کہا۔ بیٹا، یوگ کا پالن کرو، یوگ کی راہ پر چلو۔ تمہاری سب بیماریاں دُور ہو جائیں گی۔ اور تمہاری رُوح کو بھی سکون حاصل ہوگا۔ شانتی چاروں طرف شانتی۔
یوگی نے مجھے یوگ کے اصول بتائے۔ اور اب میں آپ کو بتاتا ہوں تاکہ جس طرح میری بیماری دور ہو گئی ہے، خدا کرے آپ کو بھی اس طرح فائدہ پہنچے!
یوگ کے ایک سو بیس آسن ہیں۔
پہلا آسن:۔
سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور چھاتی پُھلا کر اندر سانس کھینچو۔ اندر سانس روکو، حتیٰ کہ پھیپھڑا پھٹ جائے۔ لیکن پھیپھڑا پھٹنے کی مطلق پروا نہ کرو۔ جب تک پھیپھڑا نہ پھٹے یوگ کا پہلا آسن مکمل نہ ہوگا۔
دوسرا آسن:۔
چت لیٹ جاؤ۔ اور اپنے پاؤں کی اُنگلیوں سے اپنے سر کو چھونے کی کوشش کرو۔ اگر ناکامیاب رہو تو پھر کوشش۔ اور کوشش کرو۔ حتیٰ کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور تمہارے

پاؤں کی انگلیاں سر سے جا لگیں۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کی مطلق پروا نہ کرو۔ کیوں کہ یہ یوگ کا دوسرا آسن ہے۔

تیسرا آسن:۔

اسے شیرشک آسن بھی کہتے ہیں۔ یعنی سر کا آسن۔ اس آسن میں مبتدی سر کے بل کھڑا ہوتا ہے۔ ٹانگیں اوپر سر نیچے۔ ہر روز دس منٹ تک اپنے کمرے میں اس طرح کھڑے رہو۔ پھر آہستہ آہستہ سے کمرے میں اسی طرح چلنے کی کوشش کرو، پھر کمرے کے باہر سڑک پر چلو۔ پھر بازار میں ٹرام کے سامنے اس طرح چلو، حتی کہ ٹریم سے ٹکرا کر تمہارا سر چکنا چور ہو جائے۔ لیکن اس کی بھی مطلق پروا نہ کرو، یوگ کا آسن تمہاری روح کو سچی خوشی عطا کریگا۔

چوتھا آسن:۔

الٹی پالتی مار کر بیٹھو (دیکھو مہاتما بدھ کی تصویر) اور دو برس تک اسی طرح بیٹھے رہو۔ حتی کہ تمہارا جسم پتھر کی طرح سخت ہو جائے۔ اور تمہیں کسی عجائب خانہ میں رکھ دیا جائے۔ لیکن اس کی بھی مطلق پروا نہ کرو۔ عجائب خانہ میں تمہاری وہ عزت و تکریم ہوگی جو تمہیں اس زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

پانچواں آسن:۔

اپنے ہاتھ پیر باندھ کر اپنے سر کو اپنی ٹانگوں میں پھنسا لو اور ایک گیند کی طرح فرش زمین پر لڑھکو، حتی کہ محلے کے لڑکے تمہیں فٹ بال سمجھ کر تم سے کھیلنے لگیں۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے تمہارا جسم ربڑ کی طرح لچکدار ہو جائیگا۔

چھٹا آسن:۔

کھڑے ہو جاؤ۔ دایاں بازو اوپر اٹھاؤ۔ اور اوپر اٹھائے رکھو جب تک کہ وہ لکڑی کی طرح سوکھ نہ جائے۔

ساتواں آسن:۔

اب بایاں بازو بھی اوپر اُٹھاؤ۔ اور اُسے بھی لکڑی کی طرح سوکھ جانے دو۔

آٹھواں آسن :۔

اب دائیں طرف کی ٹانگ اوپر اُٹھالو، اور صرف ایک ٹانگ کے سہارے تین سال تک اسی حالت میں کھڑے رہو۔

نواں آسن :۔

اب دوسری ٹانگ بھی اُٹھالو۔ اب تم فضا میں بالکل معلّق ہو۔ دیکھا تم نے یوگ کا اعجاز!

دسواں آسن :۔

لکڑی کا ایک تختہ لو جس پر لوہے کی بڑی بڑی کیلیں باہر کی طرف اُبھری ہوں۔ اب ان میخوں کے بستر پر لیٹ جاؤ۔ اور بازار میں بھیک مانگنا شروع کر دو۔

یوگ آسن کا پہلا حصّہ ختم ہوا۔

میں ابھی تک پہلے دس آسنوں کی تکمیل کر سکا ہوں۔ ابھی پچھلے سال اپنے کیلوں کے بستر پر لیٹا لیٹا کوروکشیتر کی سیر کر آیا ہوں۔ میرا تن ہر طرح کی جسمانی بیماریوں سے پاک ہے میری رُوح ہر قسم کی زمینی آلائشوں سے مبرّا۔ کوروکشیتر کے میلے پر لاکھوں جاتریوں نے میرے درشن کئے۔ اور کئی امریکیوں نے میرے فوٹو لئے۔ اور لاکھ روپیہ چڑھاوا وصول ہوا۔

اور یہ سب کچھ یوگا ئی برکت سے ہوا۔

آپ بھی یوگ کے آسن سیکھئے، اس پر عمل کیجئے۔ پورے ایک سو بیس آسنوں کا حال میری کتاب "یوگ، کیوں اور کیسے؟" میں درج ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ آوارہ یوگی پوسٹ بکس نمبر ۴۲۰ شکارپور، سندھ۔

باتیں

چند روز ہوئے میری ملاقات ایک روسی دندان ساز سے کناٹ پلیس میں ہوئی۔ یہ کوئی "سفید" روسی نہ تھا بلکہ ایک "سُرخ" روسی جس نے زاریت کے دوران میں ۱۹۱۲ء کی انقلابی جدوجہد میں حصّہ لیا تھا۔ اور پھر زاریت کے اعمالوں سے بچنے کے لئے روس سے بھاگ کر جرمنی میں آکر اُس نے دندان سازی سیکھی تھی اور دندان سازی کی ڈگری حاصل کر لینے کے بعد اُس نے سیکسونی میں اپنا کاروکار شروع کر دیا۔ یہاں آکر بھی اُس سُرخ روسی نے اپنی انقلابی سرگرمیوں کو جاری رکھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ جرمنی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی نازیوں نے اُسے حراست میں لے لیا اور اُسے ایک کن سن ٹریشن کیمپ میں قید کر دیا۔ اس حبس بالجبر کے دوران میں نازیوں نے اپنی منتقمانہ شدّت احساس سے مغلوب ہو کر اس سے جو سلوک کیا، وہ جُرم و سزا کی تاریخ میں ایک نئی، لطیف اور مہذّب بربریت کے باب کا آغاز ہے۔ اس کا مطالعہ زمانہ جاہلیت یا قرونِ وسطیٰ کی سزاؤں کے مطالعہ سے کچھ کم دلچسپ اور حیرت انگیز نہیں ہے۔

مثال کے طور پر یہ سُرخ روسی بیان کرتا ہے کہ جب مجھے کن سن ٹریشن کیمپ میں لے جایا گیا تو پہلے تین دن مجھے کھانے کے لئے کچھ نہ دیا گیا۔ چوتھے روز جب میں بھوک سے بالکل نڈھال ہو رہا تھا میرے لئے چائے اور توس مہیّا کئے گئے۔ چائے کے پیالے اور توس ایک خوشنما طشتری میں سجے سجائے میرے سامنے لائے گئے اور میں نازیوں کی اس شفقت اور مہربانی سے بہت متاثر ہوا جنہوں نے میرے لئے گرم گرم چائے اور مکھن توس مہیّا کئے تھے۔ لیکن جلد ہی میری بھوک کی بیتابی غصّہ و رنج میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ چائے میں شکر کے بجائے کالی مرچ گھولی ہوئی ہے۔ اور جب میں نے توس کا ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا تو معلوم ہوا کہ توس پر مکھن کے بجائے "ٹوتھ کریم" لگی ہوئی ہے۔ نازی پہریداروں نے مجھے ایک دندان ساز جان کر میرے کھانے کے لئے دانتوں کی کریم مہیا کی تھی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر وہ ایک لوہار کے لئے لوہا، بڑھئی کے لئے لکڑی اور اینٹیں اُٹھانیوالے مزدور کے لئے اینٹیں یا پتھر مہیّا کرتے ہوں گے۔

(۲) سردیوں کے دنوں میں جب وہاں درجۂ حرارت صفر کے قریب ہوتا ہی یا اس سے بھی کم۔ ایک دفعہ مجھے ایک کھلے میدان میں بٹھا دیا گیا اور ایک پانی سے بھرا ہوا اور ایک خالی ٹب میرے سامنے رکھ دیا گیا اور ایک چمچہ میرے ہاتھ میں تھما کر مجھ سے کہا گیا کہ میں اس چمچہ سے پانی نکال کر دوسرے ٹب میں بھرتا رہوں۔ حتیٰ کہ پہلے ٹب کا سارا پانی دوسرے ٹب میں آجائے، مقصد یہ تھا کہ جاڑے کی برفیلی ہواؤں کے تیز فرّاٹے میرے ننگے بدن کو چھوتے رہیں۔ میں اسی طرح دو ڈھائی گھنٹے تک برابر اسی چمچہ سے ایک ٹب سے پانی نکال کر دوسرے ٹب میں بھرتا رہا۔ اور جب دوسرا ٹب پُر ہونیکو آیا تو ایک نازی پہریدار نے یکایک وہ ٹب اُٹھا کر میرے اوپر انڈیل دیا اور پھر خود قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں نیلے ہو گئے اور پھر کئی دن تک میرا ہسپتال میں علاج ہوتا رہا۔

(۳) تیسرے یا چوتھے دن کیمپ میں چند لوگوں کو گولی سے اُڑایا جاتا تھا۔ میں اپنی

زندگی سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ ہر روز دعا مانگتا تھا کہ میری باری بھی جلد آجائے۔ تاکہ اس خوفناک اذیت سے جلد نجات پاؤں۔ ایک دن صبح کو اتوار کے دن مجھے نازی پہریدار نے جگایا۔ دروازے سے باہر پوری مسلح گارد کھڑی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آج مجھے گولی مار دی جائیگی۔ گارد کی معیت میں ہیں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتے ہوئے مجھے کمان افسر کے سامنے لے جایا گیا۔ جس نے میرے لئے سزائے موت کا حکم دیا۔ اسکے بعد مجھے پھر گارد کی معیت میں اس جگہ بھیجدیا گیا جہاں لوگوں کو گولی سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ایک دیوار سے کھڑا کر دیا گیا۔

"ایک" "دو" زندگی کے آخری لمحے جو صدیوں کی طرح لمبے معلوم ہوئے۔ "ہالٹ" کمان افسر نے پکارا۔ میرا کلیجہ اچک کر منہ میں آرہا۔ یہ کیا ہوا تھا۔ کیا میری جان بخشدی گئی تھی۔

یکایک کمان افسر میری طرف دیکھکر مسکرا کر بولا۔ اس کمبخت روسی پر اتنی جرمن گولی کی باڑھ خرچ کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ بہتر یہی ہو کہ اسکے ہاتھ میں ایک پستول دیدیا جائے اور اسے ہم سب کے سامنے خودکشی کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

مجبوری کا تو سوال ہی وہاں نہ تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک پستول تھما دیا گیا۔ پوری گارد میری طرف شست باندھے کھڑی تھی۔ پستول کنپٹیوں سے لگا تھا۔ "ایک" "دو" "تین" میں نے لبلبی دبائی۔ پستول خالی تھا۔ میں بیہوش ہو گیا اور وہاں کے ہسپتال میں پڑا رہا۔ ہسپتال سے واپس آکر مجھے زمین کھودنے کا کام دیا گیا۔ لیکن اس علاقہ کی زمین نرم نہیں ہے۔ نہایت سنگلاخ ہے۔ یہ زمین کھودتے کھودتے جس میں مٹی کم تھی اور پتھر زیادہ میرے دونوں ہاتھوں میں زخم پیدا ہو گئے۔ باہر کی جلد اڑ گئی اور سرخ سرخ گوشت نکل آیا۔ زیادہ مصروف اور سیاسی طور پر خطرناک قیدیوں کو گولی کی باڑھ سے اڑایا نہ جاتا تھا۔ ان کے لئے دوسرے طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ ایک طریقہ تو یہی تھا کہ جس سے جلد سے جلد

ہی آدمی خون میں زہر پیدا ہو جانے کی وجہ سے مر جاتا تھا اور نازی ڈاکٹر زہر باد سے مر جانے کا سرٹیفکٹ دے کر معاملہ کو وہیں ختم کر دیتے تھے۔ اب دوسرا طریقہ سنیئے، ہمارے کن سن ٹریشن کیمپ کے قریب کوئلے کی کانیں تھیں۔ کوئلہ کھود کر لادنے کا کام قیدیوں کے ذمہ تھا۔ یہ جگہیں سب سے زیادہ خطرناک تھیں۔ قیدیوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ گاڑیوں میں کوئلہ بھر کر انہیں اپنے ہاتھ سے چلاتے ہوئے گودام میں لے جائیں۔ ڈھلواں پیچاں راستے تھے اور ہم لوگ کام سے ناواقف، دو تین دفعہ مجھے بھی یہ کام سونپا گیا لیکن میں ہمیشہ ہوشیاری اور چابکدستی سے اس کام کو انجام دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک نازی پہرے دار نے مجھے ایک کوئلے سے بھری ہوئی گاڑی کے آگے جوت دیا جس طرح گھوڑے کو جوتا جاتا ہے، اور پھر گاڑی کو زور سے ایک خطرناک ڈھلوان پر دھکیل دیا۔ گاڑی خوفناک رفتار سے کان کے اندر ریل کی پٹڑی پر گزر رہی تھی۔ سامنے کوئلے کی دیوار قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ قریب اور قریب تر...... میں اپنی رفتار روک نہ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئلے کی دیوار سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جائے۔ اور پھر ڈاکٹر میری نعش کا معائنہ کر کے رجسٹر میں لکھ دیگا۔ موت کان میں حادثہ کی وجہ سے ہوئی۔ اور بس یکایک میں نے اپنے قدم سنبھال لئے اور ریل کی پٹڑی کے باہر جا گرا۔ میرے بجائے کوئلہ کی بھری ہوئی گاڑی دیوار سے ٹکرا گئی۔ پھر بھی مجھے بہت سے زخم آئے اور میں بہت عرصہ بیمار رہا...... میری صحت اس قدر خراب ہو گئی کہ جب پہلی بار بہزار کوشش میری بیوی اور میرے لڑکے کو مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی اور جب مجھے ان کے سامنے لے جایا گیا تو میری بیوی میرے بجائے پہرے دار کا منہ تکنے لگی۔

پہریدار بولا "میرا منہ کیوں تک رہی۔ اب کیا چاہتی ہے تو"

میری بیوی بولی "میں اپنے خاوند سے ملنا چاہتی ہوں"

"تمہارا خاوند!" پہریدار اُسے ایک فحش گالی دے کر بولا "تمہارا خاوند وہ کھڑا ہے سامنے"

میرا اپنا لڑکا اور میری اپنی بیوی مجھے پہچان نہ سکتے تھے۔ کیونکہ میرے رخساروں اور

ہاتھوں پر زخم پیدا ہو گئے تھے اور میرے سر کے بال غائب ہو چکے تھے۔

روسی دندان ساز کی داستان سے ایک نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بربریت چاہے وہ کتنی ہی لطیف اور مہذب کیوں نہ ہو آخر بربریت ہی ہے۔

"جرم و سزا" کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ انسان ابھی انسان نہیں ہے اور افراد اور قومیں اس مسئلہ پر اسی منتقمانہ نظریئے پر عمل کرتی ہیں جو آج سے چند ہزار سال پہلے ہمارے بزرگوں نے تخلیق کیا تھا۔ گو زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوئی ہے۔ تعلیم، تہذیب، سائنس، لیکن انسان کے بنیادی جذبات ابھی تک وہی ہیں۔ ڈر، نفرت، انتقام اس لئے بھی اگر سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ انفرادی انقلاب نہ ہوا تو انسان کی تقدیر کو بدلنا بہت مشکل ہو جائیگا۔ یو جنگ ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سماجی انقلاب۔ فاشی جماعتیں سماجی انقلاب سے زیادہ اس انفرادی انقلاب کی دشمن ہیں جو فرد کے اندر اس ذہنی عملئے کی ترویج چاہتا ہے جسکے بغیر کسی بہتر سماجی انقلاب کی بقا نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے تو وہ اپنے ریاستی نظام میں فرد کی "انا" کو یکسر مٹا دینے پر تل گئی ہیں۔

مشرق نے فرد کی وحدت پر زور دیا ہے۔ اس خطرناک حد تک کہ سارے مشرقی ملکوں میں کم و بیش سماجی تنظیم کا کام بیحد دقت طلب ہو گیا ہے۔ برخلاف اسکے مغرب نے ایک خطرناک اجتماعیت کی بنیاد ڈالی ہے جس میں فرد ایک بے جان اکائی بن کر رہ گیا ہے۔ ان دونوں حدوں کے درمیان انسانی ترقی کے لئے کہیں ایک رہ گزار موجود ہے جہاں فرد کی "انا" اور اس کی روح کو برقرار رکھ کر ایک خوبصورت اجتماعی نظام کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ شاید انسان کو یہ راستہ ڈھونڈنے تک ابھی ایک دو جنگیں اور لڑنا پڑیں گی۔

جمہوریوں کے ادعا کو بھی شبہات کی نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ یہ رہ گزار فاسیوں کا رہ گزار ہرگز نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ اس امر سے بخوبی

واقف ہیں ان کی بھی وہ شدت احساس موجود نہیں ہے جو انہیں ایک صحیح اور جامع لائحۂ کار پر مجبور کر سکے۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یورپ کے بیشتر ملکوں میں اشتراکیوں کو یورپی سیاست میں خاصہ دخل حاصل تھا۔ جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی نازیوں سے ٹکر لے سکتی تھی۔ عوام میں اس کا رسوخ بہت تھا، فرانس میں بلم اور اس کی پوپولیر برسر اقتدار تھے۔ لیکن سب اشتراکی جماعتیں ایک دوسرے سے خائف تھیں سب فاسیوں کی دشمن تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی دشمن بھی تھیں۔ یہ خیال کہ کہیں اکٹھے ملکر کام کرنے سے دوسری اشتراکی جماعت کو زیادہ تقویت حاصل نہ ہو جائے، انہیں کبھی اکٹھا ملکر کام کرنے ہی نہ دیا تھا۔ جب جرمنی کے سوشل ڈیموکریٹ اور اشتراکی ملکر نازیوں کا صفایا کر سکتے تھے۔ ان دنوں حالت یہ تھی کہ اشتراکی اور سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں فاسیوں کے خلاف بڑے بڑے جلوس نکالتی تھیں۔ اینٹی فاسسٹ نعرے بلند کئے جاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ اشتراکی جماعت سوشل ڈیموکریٹ جماعت کو اور سوشل ڈیموکریٹ جماعت اشتراکیوں کو صلواتیں سناتی تھیں۔ دونوں کے ہاتھ میں سرخ جھنڈے ہوتے تھے اور وہی مزدور، کسان، انقلاب کی تثلیث، یہی کچھ فرانس میں ہوا۔ اور آسٹریا میں اور دیگر کئی یورپی ملکوں میں فاسیوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا اور سارے یورپ بلکہ ساری دنیا کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا۔

جنگ سے پہلے جو حال یورپ کی ترقی پسند عوامی جماعتوں کا تھا وہی حال آج ہندوستان میں ہماری ترقی پسند جماعت کا ہے۔ نفرت، انتقام، ڈر، اعمل، اتفاق، یک جہتی کہیں موجود نہیں، شاید دشمن کے ظلم ہی اس انتشار کو دور کر سکیں، شاید اس لئے کہ اس مرحلہ پر پہنچکر بہت سے لوگ چلا اٹھیں گے، اب ہم کیا کریں، افسوس اب تو بہت دیر ہو گئی ہے..... شاید اس مرحلہ پر پہونچکر ہمیں اکٹھا مل کر کام کرنیکا موقع نصیب نہ ہو۔

اس مرحلے پر پہونچکر جرمنی، فرانس، چیکوسلواکیا کے ادیبوں کی طرح ہم میں سے بھی کئی ادیبوں کو خودکشی کرنا پڑے گی..... کیونکہ ادیب زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور جب ساری قوم خودکشی کر رہی ہو، اس وقت ایک حسّاس ادیب کے سامنے اپنا گلا گھونٹ دینے کے سوا اور کیا چارہ باقی رہ جاتا ہے۔

اِنتفاخ

لفظ انتفاخ گرگٹ کی طرح ہے۔ یہ لفظ ہر لحظہ، ہر آن رنگ بدلتا ہے جیسا موقع محل ہو اسی طرح یہ بھی اپنا بھیس تبدیل کر لیتا ہے۔ کبھی کچھ مطلب ہوتا ہے اس کا۔ کبھی کچھ اور۔ اس کے معانی نہ صرف وقت کے ساتھ بلکہ آدمی کے ساتھ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں اس لفظ کے معانی کچھ سمجھتا ہوں اور وزیر ہند اس کے معنی اور لیتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میرے خیال میں انتفاخ لغت میں سب سے عجیب و غریب لفظ ہے!

انتفاخ غالباً نفخ سے نکلا ہے۔ بعض لوگوں کا پیٹ نفخ سے پھول جاتا ہے۔ جس طرح بائیسکل کا ٹائیر ہوا سے پھول جاتا ہے۔ لیکن انتفاخ صرف ٹائیروں ہی کو نہیں ہوتا آدمیوں کو بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً جب ان کے دل میں شدت کی ہوا بھر دی جائے زیادہ انتفاخ اچھا نہیں ہوتا۔ اس میں ٹائر کے پھٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور میں نے کئی آدمی مسرت کے انتفاخ سے مرتے دیکھے ہیں۔ غالباً ہندوستان میں آجکل یہی ہو رہا ہے۔ لوگوں کا دل اور پیٹ انتفاخ سے پھول جاتا ہے اور پھر وہ مر جاتے ہیں۔

چند روز ہوئے میں مارشل کی "اقتصادیات" پڑھ رہا تھا۔ لیجیے اب پتہ چلا کہ انتفاخ ایک اقتصادی اصطلاح ہے۔ اس کا ٹائروں اور آدمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا رشتہ تو روپیہ اور شرح مبادلہ سے ہے۔ کچھ ٹھیک طرح سے تو یاد نہیں، لیکن غالباً مارشل کا مفہوم یہ تھا کہ جب ریاست میں سونے کا ذخیرہ تھوڑا رہتا ہے یا کم ہو جاتا ہے، اور بخلاف اسکے کاغذی کرنسی کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو اس عملئے سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے اُسے انتفاخ کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جب کسی ریاست میں سونا کم اور کاغذ زیادہ ہو جاتا ہے جیسا کہ پچھلی جنگ عظیم میں جرمنی میں ہوا تھا تو اس صورت حال کو اقتصادی اصطلاح میں انتفاخ کہتے ہیں۔

انتفاخ یا صلح نامہ ورسائے یا ایک اور جنگ عظیم، یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لغت میں لفظ انتفاخ سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ خطرناک لفظ موجود نہ ہوگا!

لیکن اب تو بیچارہ مارشل پرانا ہو چکا۔ مارشل سے لیکر مارکس تک سب اقتصادی فلسفہ بیکار ہے۔ اب تو لوگ ان کو بھی فیشن سے باہر سمجھ رہے ہیں۔ دراصل یہ زمانہ روز ویلٹ کے نئے میثاق کا ہے، یا بیورج صاحب کی انشورنس اسکیم کا۔ اب نیا زمانہ آیا ہے اور اپنے ساتھ نئے خیالات اور نئی اصطلاحیں لایا ہے۔ چنانچہ اب انتفاخ نے بھی گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدل لیا۔ اب اس کا ٹائروں سے، انسانی خوشی سے، روپے سے، شرح مبادلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اس کا تعلق صرف انسانی معدے سے ہے۔ اس نئی اصلاح کے موجد مشہور انگریزی سیاست داں مسٹر ایل، ایس، المبری ہیں۔ لیکن یہاں پر میرے ذہن میں اُس لنچ کی یاد تازہ ہوتی ہے جو ایک بار شیام نے میرے ساتھ کھایا تھا.....!

شیام کا قد چھ فٹ تین انچ ہے۔ نوجوان ہے، غیر ذمہ دار اور اک ذراسی بات پر خفا ہونے اور خفگی کے عالم میں میز پر مکا مارنے کا عادی۔ اُسکی یہ عادت بہت پیاری لگتی ہے۔

جب تک کہ میز ٹوٹ نہ جائے، میز ٹوٹنے کے بعد تو ——— خیر!

لیکن اس کا تو میں بھی اقرار کروں گا کہ اس روز اُس کی خفگی بجا تھی۔ یہ لنچ ذرا ہلکی قسم کا تھا۔ مگر دیکھئے صاحب! آجکل کے زمانے میں آپ اپنے میزبان سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ کیا وہ اپنا سر آپ کو بھون کر کھلا دے؟ ہیں؟۔

شیام نے میز پر مکّا مار کر کہا "میں بھوکا ہوں، اس لنچ سے میرا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ میں بھوکا ہوں" وہ شیر کی طرح گرجا۔

میں نے نہایت مسکین لہجے میں جواب دیا "نہیں حضور والا۔ آپ کو بھوک نہیں ہے۔ اس بیماری کو انتفاخ کہتے ہیں!"

"انتفاخ؟ وہ کیا ہوتا ہے" شیام نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا "تمھیں زیادہ کھانے کا مرض ہے۔ آجکل ہر ہندوستانی کو زیادہ کھانے کا مرض ہے۔ اسی سے انتفاخ پیدا ہوتا ہے، جب تم زیادہ کھاتے ہو تو پیٹ بھی اسی نسبت سے پھولتا ہے۔ اس سے اندر کا خلا اور بھی بڑھ جاتا ہے اور تم زیادہ بھوک محسوس کرتے ہو اور کھاتے ہو۔ پھر خلا بڑھ جاتا ہے اور تمہیں پھر بھوک لگتی ہے۔ اور اگر ارلعہ لگاؤ تو صاف پتہ چلے گا کہ تمہارے پیٹ کی وسعت اور اندرونی خلا کا اس غذا سے براہ راست تعلق ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے، سمجھے؟

"لیکن راشن تو وہی مقررہ مقدار میں ملتا ہے!" شیام نے پوچھا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے" میں نے فوراً جواب دیا "فرض کر لو کہ راشن کا حجم وہی ہے لیکن تمہارے پیٹ کا حجم تو بڑھ چکا ہے۔ راشن وہی ہے لیکن معدے کا حجم زیادہ ہے، اس سے بیچ میں کچھ خلا رہ جاتی ہے۔ اور تم بھوک محسوس کرتے ہو۔ پھر وہی انتفاخ!

اوہ ——— میرا سر چکرا رہا ہے۔ شیام نے نیم بیہوشی کے عالم میں کہا۔

ہا! یہ پھر وہی انتفاخ ہے۔ جوں جوں تمہارے معدے کی خلا بڑھتی جاتی ہے،

تمہارے دماغ کی قوت گھٹتی جاتی ہے۔ دماغ کی قوت اسی نسبت سے کم ہوتی ہے جس نسبت سے تمہارے معدے کی خلا یا سوجن بڑھتی ہے۔ اگر تم اربعہ لگا کر دیکھو......

اِس بکواس کو بند کرو۔ شیام نے چلّا کر کہا۔ مَیں اقلیدس سے باز آیا۔ مجھے کھانا دو۔ مَیں بھوکا ہوں۔ یہ کہکر اُس نے میز پر اس زور سے مکّا مارا کہ میز ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر جا گری۔

پروا نہ کرو میری جان! میں نے میز کے ٹکڑے چُنتے ہوئے کہا۔ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ اب اک نیا زمانہ آنے والا ہے، اک نیا دَور، نئی زندگی، نیا ترانہ، کیا تم نے اُس مشہور انگریز سیاست داں کی تقریر نہیں پڑھی۔

لیکن مَیں تقریر نہیں کھا سکتا۔ شیام نے احتجاجاً کہا۔ اس سے مجھے بد ہضمی ہو جائیگی اور پھر شاید یہ بات صاحب تقریر کی شان کے منافی بھی ہو۔ اور میری بھوک.....

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تقریر کھاؤ۔

"پھر کیا کھاؤں؟" شیام غصّے سے گھورنے لگا۔

مَیں ذرا پرے سرک گیا۔ اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیکر بولا۔ "ٹھیرو ذرا مجھے سوچنے دو۔

چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال رینگتا ہوا آیا۔ اور مَیں خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور میں نے شیام کے شانے جھنجوڑ کر کہا۔

کیا ترکیب سوجھی ہے، ہاتھ ملاؤ یار، میری پیٹھ ٹھونک دو....

بھئی خدا کے لئے جلد بتا دو۔ شیام نے بالکل زچ ہو کر کہا۔

سنو، تم نے اُونٹ دیکھا ہے۔ اونٹ۔

اُونٹ؟

ہاں ہاں اونٹ! وہ جس کی پیٹھ پر کوہان ہوتا ہے۔

'جانتا ہوں، پھر۔ اُس نے کہا۔

سنو تو، اونٹ تمہیں معلوم ہے۔ سترہ دن اور سترہ راتیں ریگستان میں کھائے پیئے بغیر پھر سکتا ہے۔ نہ اُسے خوراک کی ضرورت ہے، نہ پانی کی۔ بس چلا جا رہا ہے بے کھٹکے۔ کیوں؟ کوہان جو ہوتا ہے اسکی پیٹھ پر۔ کوہان غذا کا ذخیرہ ہوتا ہے نا۔ جس طرح ہم آج کل پٹرول کے ذخیرے بناتے ہیں۔ بس تم یہ کرو کہ اپنی پیٹھ پر اونٹ کی طرح ایک کوہان اُگا لو!

مگر میں اونٹ نہیں ہوں، میرے بھائی۔ یہ ہندوستان ہے، ریگستان نہیں ہے۔ اوہ...... مجھے کسقدر بھوک لگی ہے!

تم پھر غلط کہتے ہو۔ میری جان یہ بھوک نہیں ہے۔ اس بیماری کو انتفاخ کہتے ہیں۔

"انتفاخ؟ انتفاخ؟ اچھا تو اس کا علاج کیا ہے؟"

انقلاب۔ میرا مطلب ہے ایک غذائی انقلاب ——— آٹا، چاول، دال، گوشت، سبزی، ترکاری نہ کھاؤ۔ صرف گھاس کھاؤ۔ جیسا کہ میں نے سُنا ہے، لوگ بیجاپور میں گھاس کھاتے ہیں۔

گھاس کھاؤں؟ کیا تم گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔

جبھی تو ایسی باتیں کر رہا ہوں۔

"آہ۔ میں سمجھا۔ تم پاگل ہو؟ بالکل۔ ایک دم دیوانے ہو۔ خدا کے لئے مجھے پانی کا ایک گلاس پلا دو۔ پھر میں خاموشی سے تمہارے گھر سے واپس چلا جاؤں گا۔ میں باز آیا۔ مجھے یہ لنچ کھانا منظور نہیں۔" شیام نے کہا۔

جب اُس نے پانی کے تین گلاس پیئے۔ اور اپنے معدے کو پانی سے اچھی طرح بھر لیا تو وہ ہوش میں آیا۔ آہستہ آہستہ اسکی طبیعت میں سکون پیدا ہوا پھر اُسکے چہرے

پر ایک حزیں مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔

عزیز دوست یہ دُنیا کتنی عجیب ہے مجھے ہنسی آتی ہے یہ سوچ کر کہ پُرانے زمانے میں ہمارے ہندو مہاراجاؤں اور بعد میں مغل بادشاہوں کو قحط دور کرنے کا یہ طریقہ معلوم نہ تھا!

اسی لئے تو وہ اپنی سلطنت گنوا بیٹھے دوست! لو پانی کا ایک گلاس اور پیو!

آج میں پھر قسم کھاتا ہوں!

(ڈائری کے چند ورق)

.... سپاہی سڑک پر مارچ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ سنگلاخ سڑک کا سینہ سخت اور نیلا ہے اور وہ اس پر گاتے ہوئے آرہے ہیں۔ راگھوپتی راجہ رام .... جیالے مرہٹہ سپاہی راگھوپتی راجہ رام کی شان و شوکت کی یاد تازہ کرتے ہوئے راگھوپتی راجہ رام کا گیت گا رہے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ اس گیت کے اندر جو شکوہ اور سطوت چھپی ہوئی ہے وہ ہزاروں سال گزرے ختم ہو چکی۔ اب کہیں اس کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ آخر یہ لوگ ماضی کی طرف کیوں بھاگتے ہیں۔ مستقبل کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ ماضی کو زندہ کرنے کی فکر میں کیوں ہیں۔ یہ امر بے حد دلچسپ ہے کہ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی جوانی کے حسین لمحات، اپنے ماضی کے بیتے ہوئے سنہری لمحات کی یاد تازہ کر کے خوش ہوتا ہے، اور جب قوم بوڑھی ہو جاتی ہے تو دوسری قوموں کو جتاتی ہے، جانتے ہو آج سے دو ہزار سال پہلے میں نے وہ کام کیے، وہ معرکے .....؟ راگھو نہیں راجہ رام!

سپاہی مارچ کر رہے ہیں۔ مرہٹہ سپاہی گزر گئے۔ یہ دستہ بہادر مسلمان سپاہیوں کا ہے۔ اللہ اکبر کا نعرہ ہے اور پھر وہی گیت، ماضی کا حسن، اور ماضی کا آرٹ اور وہی بہتے

ہوئے زمانے کو بلانے کی آرزو۔ مرہٹہ اور مسلمان سپاہی دونوں ایک ہی حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں۔ بڑی دل چسپ بات ہے۔ شاہ افغانیہ، ایک دفعہ پھر.... کاش کوئی ایک دفعہ پھر اُسی تابندہ ماضی کی جھلک دکھا دے! دراصل ان گیتوں میں کچھ رہا نہیں، ان کا مطلب کچھ نہیں ہے۔ یہ گیت اپنی رُوح کھو چکے ہیں اور گیت نہیں بھوت بن کر اس سنگلاخ، سخت اور نیلی سڑک پر مارچ کرتے جاتے ہیں۔ یہ سڑک جو ایک سستے قسم کے آئینے کی طرح چمک رہی ہے!

کاش کوئی ہمیں نیا گیت دیدے، ایک نئی اُمید، ایک نیا مستقبل اور ان پُرانے دقیانوسی گھِسے ہوئے گیتوں کو لیلے۔ جی چاہتا ہے ان پُرانے گیتوں کو بدل ڈالوں، اور اس ملک میں ——— لیکن اس ملک میں کس چیز کو بدل ڈالوں؟ کمبخت یہ سیاست پھر آن دھمکی اور میں نے آج اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ کم از کم آج تو اس موضوع کے متعلق کچھ نہیں سوچوں گا۔..... آج میں پھر قسم کھاتا ہوں!......

ا ——— فلم دیکھی، اچھی تصویر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہندوستان میں لوگ اچھی تصویر کیوں بناتے ہیں۔ اچھی تصویر کا مصرف ہی کیا ہے؟ کسی فلم ڈائرکٹر کو ایسی غلطی نہ کرنی چاہیئے۔ کیا میں امید کروں کہ ڈائرکٹر ان کبھی ایسی غلطی نہ کریں گے۔ اس تصویر میں پ۔ نے ایک بدمعاش آدمی کا پارٹ بہت عمدہ طریق پر ادا کیا ہے۔ پ ——— ہمیشہ ہیرو کا پارٹ کرتا ہے۔ لیکن اس کے چہرے کی ساخت، اس کی خشونت اور اس کی ٹھوڑی کی سختی میرے خیال میں ہمیشہ اس امر کی متقاضی رہی ہے کہ اُسے ایک بدمعاش آدمی کا پارٹ دیا جائے۔ نہ جانے لوگ فلم میں ہیرو کو کیوں بدمعاش پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیچارہ پ ——— ابھی تک ہیرو بننے پر مجبور ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہر آدمی اپنے آپ کو ہیرو تصور کرتا ہے اور جو ہم اپنے لاشعور کی گہرائیوں میں خواب دیکھتے ہیں انہیں خوابوں کو

فلم کے پردے پر دیکھنا پسند کرتے ہیں ..... ہیرو! بدمعاش نہیں! درحالیکہ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ہم لوگ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں "بدمعاش" ہیں۔ ہم اپنا جسم بیچتے ہیں چند ٹکوں کے لئے، اپنے آرٹ اور مذہب اور روحانیت کو طوائف بناکر چند ٹکوں کے لئے غیروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی لاج کو، اپنے ملک کو اپنی ناتمام ذاتی حرص کی آگ میں جھونک دیتے ہیں اور جب سب کچھ جلکر خاکستر ہوجاتا ہے تو زور زور سے چلّاتے ہیں: "راگھو نہیں راجہ رام.....؟"

غضب ہو گیا؛ عجب اُلٹ پھیر ہو گیا۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ذکر ہو رہا تھا الف فلم کا اور "پ" اداکار کا اور بیچ میں پھر وہی سیاست؟..... دراصل ہمارے سماج کی زندگی ہی کچھ ایسی الٹی سیدھی ٹیڑھی بیڑھی اُلجھی سلجھی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہاں پر جن لوگوں کو ہیرو کا پارٹ دیا جانا چاہیئے وہ بدمعاش کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ جنہیں حکومت کرنا چاہیئے وہ چکّی پیس رہے ہیں۔ جنھیں تقریر کرنا چاہیئے وہ چنے بیچ رہے ہیں اور جنھیں لکھنا چاہیئے وہ سپاہی بنے ہوئے ہیں۔ الف فلم سے یہی بات عیاں ہوتی ہے.....

لیکن یہ ایک اور کہانی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ابھی کئی سال درکار ہیں۔ "ش" نے پہلی بار اس فلم میں کام کیا ہے۔ لیکن کہیں بھی وہ ڈری، سہمی، جھجکی نہیں۔ کیمرے کا ڈر برا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو "ش" کے دانتوں پر اعتراض ہے۔ مجھے تو اُس کے دانت اچھے بھلے معلوم ہوئے بلکہ اس کے چہرے پر ایک عجیب بہار کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ میں نے تو اس سے بھی بُرے دانتوں والی ہیروئن دیکھی ہیں۔ بلکہ ایسی ہیروئن بھی دیکھی ہیں جن کے دانت شروع ہی سے غائب تھے اور اُن کی اداکاری بھی بہت بُری تھی..... پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟ یونہی.....!

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، جب میں ریس کورس پہونچی۔ ڈر تھا کہیں ریس ملتوی

نہ کر دی جائے، لیکن بارش جلد تھم گئی۔ گھوڑے سب اچھے تھے، عورتیں سب بدصورت نظر آئیں اور آدمی سب بددیانت تھے۔ درصل یہ ریس کا پہلا اصول ہے کہ اپنے بہترین دوست کو بدترین ٹپ ورنہ تم کبھی جیت نہ سکو گے۔ شاید اسی وجہ سے میں بچھتر روپے ہار گیا۔ خیر ——— اچھی دل چسپی رہی ریس پر، کرامت بھی وہیں تھا، ایک رنگین وِلمر اوڑھے ہوئے، اُسے زکام کی شکایت تھی اور وہ گھر پر بالکل اکیلا اور بے یارو مددگار محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے رئیس کورس پر زکام بانٹنے اور دوستوں سے خوش فعلیاں کرنے چلا آیا۔ یہاں ہر شخص خوش ہے۔ ریس میں روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے، گندے پانی کی طرح ...... اور پانی اپنی سطح ہمیشہ ہموار رکھتا ہے!

مہاراجہ ——— دُوربین لگائے گھوڑ دوڑ دیکھ رہا تھا اور بھونڈے قہقہے لگا رہا تھا۔ اُس کا موٹا، بھدا جسم ان قہقہوں سے بار بار اس طرح ہلتا تھا کہ بعض لوگوں کو گھوڑ دوڑ دیکھنے کے بجائے مہاراجہ کا ہلتا ہوا جسم دیکھ کر زیادہ مسرّت حاصل ہوتی تھی۔ لیڈی ح ——— ایک بڑھیا سایہ پہنے اپنے گیارھویں عاشق کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور اُس کا گیارھواں عاشق فلمی دُنیا کی ایک "ایکٹرا لڑکی" سے آنکھیں لڑانے میں مشغول تھا وہ ایکٹرا جو ہیروئن بننا چاہتی تھی ...... زندگی کس قدر عجیب ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے ...... کیا یہ امر عجیب نہیں کہ میں گھوڑ دوڑ کے میدان کے سامنے کھڑا ہوں اور یہ منظر دیکھ رہا ہوں ...... قہقہے، گھوڑے، مہاراجے، عورتوں کے سرسراتے ہوئے سائے ...... یکایک یہ منظر دھندلا ہو جاتا ہے اور میں ایک دُبلے پتلے بوڑھے آدمی کو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا دیکھتا ہوں، یہ دُبلا پتلا بوڑھا آدمی اُداس اُداس سا کیوں کھڑا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ یہ گھوڑ دوڑ کا میدان ہے اور یہاں روپیہ ہے اور محبت ہے اور ہنسی ہے اور نغمہ ہے۔ بڑے بڑے بورڈوں پر گھوڑوں کے نام جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ گولڈن، روشنر، شاہ نواز،

تھوبلڈ۔ وہ بوڑھا آدمی لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اُداس کھڑا ہے۔ سردار اختر، جوالا، بہرام، بوڑھا آدمی لوہے کی سلاخوں میں بند ہے۔ چندو لال بوجی ——— بوڑھا آدمی جیل کی سلاخوں سے باہر جھانک رہا ہے، مہاراجہ قہقہے لگا رہا ہے۔ اخاہ، اس کا گھوڑا ریس جیت گیا ہے۔ اور ہنستے ہنستے مہاراجہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اس کا گھوڑا ریس جیت گیا ہے۔ کون یہ ریس جیتا ہے؟ وہ بوڑھا ابھی تک وہیں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے۔ ہنسو! ہنسو! اے دُبلے پتلے بڈھے تو خاموش کیوں ہے۔ بیوقوف، دیکھ ابھی ریس جاری ہے اور گھوڑ دوڑ کا میدان قہقہوں سے معمور ہے!

کھانے کی میز پر...... میں پچھتر روپے ہار آیا ہوں اور بدمعاش باورچی نے کھانا بھی اچھا نہیں تیار کیا۔ یہ باورچی بے حد جاہل ہے۔ کام چور...... زمین میں دھندلی دھندلی سی تصویریں اُجاگر ہو رہی ہیں۔ وہ لمحے کے لئے چمکتی ہیں۔ پھر پگھل جاتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کی طرح، اوپر اُٹھتی ہیں، پھر اچانک کسی گہرے نشیب میں غائب ہو جاتی ہیں۔ لوہے کی سلاخیں پگھلتی ہیں اور مہاراجہ کے قہقہوں میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ ریس میں جیتے ہوئے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں اور اپنے چمکتے ہوئے دانتوں کی نمائش کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے، بُرے بھدّے دانت۔ نٹ کے دانت بھی تو بُرے ہیں۔ "بٹ" ایک بچھیری ہے جو پہلی بار فلم میں دوڑ رہی ہے کون جیتا ہے یہ ریس؟ بوڑھا لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا پوچھ رہا ہے! اور مہاراجہ قہقہے لگا رہا ہے۔ "بپ" فلم میں مر گئی ہے اور تماشائی ہال میں بیٹھے رو رہے ہیں۔ جعلی موت، جعلی آنسو، مگرمچھ کے آنسو، کیا سچ مچ مگرمچھ روتے ہیں، میں نے تو آج تک کسی مگرمچھ کو روتے نہیں دیکھا۔ اور وہاں ریس پر تو ہنس رہے تھے۔ مگر میرے باورچی نے آج کھانا اچھا نہیں پکایا۔ بدھو، نالائق، ایک دم گولی مار دینے کے لائق ہے یہ سوّر۔ بیجاپور میں لوگ گھاس کھا رہے ہیں۔ گھاس میں سنا ہے وٹامن بہت ہوتا

ہے اور گھاس کھا کر دن بھر بُھد کتے رہتے ہیں۔ پھر بیجاپور کے لوگ بھی اگر گھاس کھا کر خوش نہ ہوں اور اپنے ارضی اور عرشی خداؤں کو یاد نہ کریں تو اس میں کس کا قصور ہے؟...... کسقدر خوش قسمت ہیں بیجاپور کے قحط زدہ لوگ......!

کاش میں گھاس کا ٹڈا ہوتا! کاش میں ریس جیتنے والا گھوڑا ہوتا...... کاش...... یہ لوہے کی سلاخیں نہ ہوتیں...... کاش...... میں...... کچھ نہ سوچ سکتا اور اس بدبخت سیاست کو بھلا سکتا! کیا یہ ممکن نہیں کہ میں پھر اپنے آپ سے وعدہ کرلوں!

......آج میں پھر قسم کھاتا ہوں!

ختم شد

کتبہ: ام: احمد رحمانی

اپریل سنہ ۵۳ ۱۹ء